اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جولائی ۲۰۱۴ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۱۸، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۱۴ء/ رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ

مشمولات

Oفکر و نظر

چہ دلاور است دزدے...... ۴

Oشذرات مدیر

پاکستان کا کرپٹ انتخابی نظام ۶

مسلمانوں کو انتہا پسند کون بنا رہا ہے؟ ۷

Oتعلیم و تربیت مکالمہ

پاکستان کی مغرب زدہ تعلیم اور اس کی اسلامی تشکیل نو کا مسئلہ — ڈاکٹر محمد امین ۹

علم الاسماء — چوہدری رفاقت علی ۳۹

Oاسلام اور مغرب مکالمہ

عالمی صلیبی جنگ کا مقابلہ بذریعہ دعوت — ڈاکٹر عبدالغنی فاروق ۴۵

جہاد ترک نہیں کیا جاسکتا — ملک احمد سرور ۴۸

Oدینی تحریکیں

جماعت اسلامی کی عظیم الشان خدمات — ڈاکٹر محمد امین ۵۳

تبلیغی جماعت عالمِ اسلام کا دینی سرمایہ ہے

اعتراض سے اعتراف تک کا سفر — مکالمہ — محمد رشید ۵۵

بسلسلہ تنظیم اسلامی کا منہج انقلاب

Oانتہاپسندی و دہشت گردی

مسلم انتہا پسندی اور دہشت گردی — پروفیسر ملک محمد حسین ۶۱

علاج کیا ہے؟

فکر و نظر

چہ دلاور است دُزدے............

پہلے زمانے میں حکمران اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کے لیے پس پردہ سازشیں کرتے تھے، جوڑتوڑ ہوتا تھا، ڈوریاں ہلائی جاتی تھیں، آدمی خریدے جاتے تھے اور جو کچھ ہوتا تھا چوری چھپے اور پس پردہ ہوتا تھا لیکن اب زمانہ 'ترقی' کر گیا ہے۔ اب پس پردہ سازشوں کے علاوہ علی الاعلان لاکھوں نہیں کروڑوں اربوں لوگوں کے فکر و نظر کو میڈیا کے زور پر (اس اصول پر عمل کرتے ہوئے کہ جھوٹ اتنی کثرت اور تواتر سے بولو، اتنا گلیمرائز ڈ کر کے پیش کرو کہ وہ سچ لگے) اغوا کر لیا جاتا ہے ان کی سوچ اور ان کے نظریات و رجحانات کو غلط رخ میں موڑ دیا جاتا ہے۔

مثلاً امریکہ کے ایک متعصب عیسائی حکمران نے یہودیوں کے ساتھ مل کر ۱۱/۹ کا ڈرامہ کیا جس کے وسیع الاطراف مقاصد تھے جن میں مرکزی حیثیت اسلام اور مسلمان دشمنی کو حاصل تھی۔۔ یہ ڈرامہ کر کے ملک میں خوف و ہراس کی فضا پیدا کی گئی، ملکی قوانین میں تبدیلیاں کی گئیں، اربوں ڈالر کا بجٹ منظور کرایا گیا، رائے عامہ کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کیا گیا تا کہ اشاعت اسلام میں رکاوٹ پھیلے، مغرب میں مسلمانوں کی آمد کم ہو اور ان کی پوزیشن کمزور ہو۔ اس ڈرامے کی آڑ میں اور کروسیڈ کے نام پر اور اسلام کا ہوّا دکھا کر سارے یورپ کو ساتھ ملا لیا گیا اور اُس افغانستان پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا گیا جہاں خالص انداز میں نفاذِ شریعت کا عمل جاری تھا اور اُس پاکستان کو گھیرنے کی کوشش کی گئی جو پہلی مسلم نیوکلیئر طاقت تھا (حالانکہ کوئی افغانی اور پاکستانی ۱۱/۹ کے واقعے میں ملوث نہ تھا)۔

مشرق وسطی میں عراق کے طاقتور مسلم حکمران صدام حسین کا اقتدار ختم کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ عراق کے تباہ کن کیمیائی ہتھیاروں سے امن عالم اور امریکہ (درحقیقت اسرائیل) کے امن کو خطرہ ہے۔ یہ جھوٹ اس کثرت اور ہنرمندی سے بولا گیا (مثلاً ایک عراقی سائنسدان نے ٹی وی اسکرین پر آ کر ساری دنیا کے سامنے تسلیم کیا کہ ہم نے تباہ کن کیمیائی ہتھیار بنائے ہیں) کہ ساری دنیا نے اسے تسلیم کر لیا۔ پھر جب عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی، لاکھوں لوگ قتل کر دیئے گئے، ہزاروں گھر جلا دیئے گئے، سیکڑوں عورتوں کی آبروریزی کی گئی لیکن کوئی تباہ کن ہتھیار نہ ملے تو سابق

امریکی وزیر خارجہ نے دھیمے سے تسلیم کرلیا کہ خفیہ رپورٹیں غیر مصدقہ تھیں اور غلط ثابت ہوئیں۔

رائے عامہ کو دھوکا دینے کا تجربہ رکھنے والے امریکہ کے زیر سایہ و زیر سرپرستی آج کل پاکستان میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ پہلے یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ امریکہ کی جنگ نہیں یہ پاکستان کی جنگ ہے۔ پھر امریکہ نے قبائلیوں کو کچلنے کے لیے کہ وہ افغان مزاحمت کاروں کی مدد نہ کریں، ان میں اپنے آدمی گھسا دیئے جنھوں نے پاکستانی تنصیبات پر حملے شروع کر دیئے۔ پھر فوج کو اکسایا گیا کہ ان پاکستان دشمنوں کے خلاف آپریشن ضروری ہے چنانچہ فوج نے قبائلی 'دہشت گردوں' کو کچلنے کے لیے آپریشن شروع کر دیا جس کا خرچ امریکہ اٹھا رہا ہے۔ پاکستانی حکمران دست بستہ ساتھ ہیں کہ انہیں اقتدار اسی یقین دہانی پر دلایا گیا تھا کہ وہ امریکہ کی غلامی جاری رکھیں گے۔ لیکن پروپیگنڈا کا کمال یہ ہے کہ یہ 'سچ' پردے میں ہے اور جو بات میڈیا کے ہر چینل بلکہ ہر اینکر پرسن، ہر سیاستدان، ہر دانشور، ہر اخبار اور ہر کالم نگار کے لبوں پر ہے وہ یہ ہے کہ یہ آپریشن پاکستان کی بقا کی جنگ ہے، آخری دہشت گرد کچلنے تک جہاد جاری رہے گا اور لطف کی بات یہ ہے کہ میڈیا کو وزیرستان تک رسائی حاصل نہیں، صحیح خبریں ملنے کی کوئی صورت نہیں، فوج زمین پر موجود نہیں لیکن ہر فضائی حملے کے بعد یہ 'سچ' بتا دیا جاتا ہے کہ اتنے دہشت گرد مارے گئے، اتنے ازبک مارے گئے۔ ہم یہ سب 'سچ' سنتے رہتے ہیں اور اس پر یقین کرتے رہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور 'سچ' ہمارے سامنے نہیں۔

پہلے زمانے میں حکمران سازشیں چوری چھپے کرتے تھے، اب زمانہ 'ترقی' کر گیا ہے، وارداتیں سرعام ہوتی ہیں اور حکمران اس ہنر سے ڈاکا ڈالتے ہیں کہ دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں خبر نہیں ہوتی۔ اگر امریکی اور یورپی رائے عامہ کو گمراہ کیا جا سکتا ہے تو پاکستانی ڈھگے کس شمار و قطار میں ہیں۔ یہ فنکاری واقعی مستحق داد ہے کہ...... چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

اللہ کرے

اللہ کرے ہم اس برس رمضان کا کچھ حق ادا کرنے کے قابل ہو سکے ہوں۔ ہم نے روزے رکھ کر ہر حال میں اللہ کی اطاعت کا سبق سیکھا ہو، غریبوں سے ہمدردی اور موانست کی ہو، مشکلات پر صبر کرنا سیکھا ہو، لذائذ اور شہوات پر ضبط کرنے کا درس لیا ہو، غیبت، چغلی، بہتان اور جھگڑوں سے بچے ہوں، ہم میں رات کے قیام کا شوق پیدا ہوا ہو، اللہ سے مانگنے اور اس کے حضور گڑگڑانے کا سلیقہ سمجھ میں آیا ہو اور اس تقویٰ کی طرف ہمارا میلان ہوا ہو جو اللہ کے نزدیک روزے کا اصل مقصد ہے۔

شذرات

پاکستان کا کرپٹ انتخابی نظام

ہم سیاستدان نہیں لیکن پاکستان کی سیاست سے ہمیں دلچسپی ہے کہ سیاسی تعلیمات دینی تعلیمات کا ایک جزو ہیں اور پاکستان کی سیاست پاکستانی عوام کے دینی و دنیاوی احوال پر اثر انداز ہوتی ہے۔

مغربی جمہوریت خلاف اسلام ہے، یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے لیکن اس وقت یہ زیر بحث نہیں۔ اس وقت جو بات زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ اس جمہوریت کی جو شکل پاکستان میں، معمولی اسلامی پیچ ورک کے بعد، اس وقت نافذ ہے اس کے تحت کیا پاکستان کے مسلمان عوام کے حقیقی نمائندے اور حقیقی رائے عامہ اوپر آسکتی ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے لہٰذا ہماری رائے میں اس کرپٹ سیاسی انتخابی نظام کی مخالفت کے علم بردار سب سے پہلے دینی سیاسی جماعتیں ہونی چاہئیں کہ یہی کرپٹ نظام ہے جس نے انہیں اوپر نہیں آنے دیا (اگرچہ اس کے دوسرے اسباب بھی ہیں)۔

لہٰذا عمران خاں کا موقف ٹھیک ہے (گو وہ سیکولر آدمی ہے اور یہ بات اسلامی پس منظر میں نہیں کہہ رہا) کہ جب تک انتخابی نظام ٹھیک نہیں ہوتا کوئی حقیقی تبدیلی ملکی قیادت میں نہیں آسکتی کیونکہ غیر ملکی طاقتیں اور ان کے حمایت یافتہ 'سٹیٹس کو' برقرار رکھنے کے علمبردار روایتی سیاستدان ملک میں کوئی حقیقی تبدیلی نہیں آنے دیں گے اور باریاں لیتے رہیں گے۔ طاہر القادری کا موقف بھی غلط نہیں ہے لیکن اس جیسے آدمی پر اعتبار کون کرے؟

ہم کہتے ہیں کہ دینی سیاسی جماعتوں، سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کے سمجھدار طبقات (وکلاء، طلباء، اساتذہ) کو اس پر متحدہ محاذ بنالینا چاہیے اور اس ایشو کو پبلک پلیٹ فارم پر لے آنا چاہیے تاکہ ایک جاندار قومی مباحثے کے بعد کچھ ایسی تجاویز سامنے آسکیں جو حقیقی تبدیلی کی راہ کھولیں مثلاً اس بات پر غور ہونا چاہیے کہ غریبوں اور متوسط طبقے کے لوگوں کی اکثریت کے نمائندے کیسے اسمبلیوں میں پہنچیں؟ علماء کی ایک اچھی تعداد کے بطور ٹیکنوکریٹس اور پروفیشنلز اسمبلی میں پہنچنے کی کیا صورت ہو؟ متناسب نمائندگی کے اصول پر عمل کرنے پر بھی غور ہونا چاہیے۔ برادریوں، جاگیرداروں اور سرمائے کے غلط استعمال کو روکنے پر بھی سوچا جانا چاہیے۔ اسمبلیوں کا عرصہ اقتدار مختصر کرنا بھی زیر بحث آنا چاہیے۔ آئین کے آرٹیکل ۶۲، ۶۳ کے وسیع تر اطلاق کی قابل عمل صورتوں پر بھی گفتگو ہونی چاہیے۔ غرض یہ کہ انتخابی اصلاح کا کام انتہائی اہم ہے، اس پر یکسوئی سے فیصلوں کے بعد نئے انتخابات جلد کروائے جاسکتے ہیں۔ یہ کوئی قرآن کا حرف نہیں کہ ہم چونکہ منتخب ہو چکے ہیں لہٰذا ہمیں اتنے سال ضروری ملنے چاہئیں۔

شذرات

مسلمانوں کو انتہا پسند کون بنا رہا ہے؟

پہلے الہجرہ والتکفیر، القاعدہ اور طالبان جیسی تحریکیں ابھریں اور اب ان میں اضافہ ہوا ہے اور حال ہی میں داعش اور بوکوحرام جیسی تنظیمیں مشرق وسطیٰ اور افریقہ میں سامنے آئی ہیں جنہیں مغرب اس لیے انتہا پسند اور دہشت گرد باور کرا رہا ہے کہ وہ مغربی استعمار اور اس کی مقامی گماشتہ مسلم حکومتوں کا ظلم برداشت نہیں کرتیں اور ان کی مسلح مزاحمت کرتی ہیں نیز نہیں سوائے مغرب کے ابلاغیاتی اداروں کے پروپیگنڈے کے جو کثرت، تکرار اور گلیمر کی وجہ سے جھوٹ کو سچ اور سفید کو کالا بنا کر دکھانے پر قادر ہے۔ فیاللاسف!

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ تنظیمیں واقعی انتہا پسند اور دہشت گرد ہیں؟ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ انتہا پسند اور دہشت گرد تنظیمیں کیوں ابھر رہی ہیں؟ وہ کیا اسباب و محرکات ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کے دین دار عناصر انتہا پسند اور دہشت گرد بن رہے ہیں؟ کوئی ہے جو اس پر غور کرے؟ یا ہم مغرب کے جھوٹے پروپیگنڈے پر ہی ایمان لاتے رہیں گے؟

ہم دین دار مسلمانوں کی انتہا پسندی کے داخلی عوامل سے انکار نہیں کرتے جیسے فرقہ واریت، جہالت اور غلط تعلیم وغیرہ اور اگر مسلمان خارجی عوامل کی وجہ سے انتہا پسندی کا شکار بنتے ہیں تو اس کے ذمہ دار بھی ظاہر ہے وہ خود ہی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ دین دار مسلمانوں کو انتہا پسند اور دہشت گرد بنانے کا سب سے بڑا ذمہ دار خود مغرب (امریکہ و یورپ) ہے جس نے تہیہ کر رکھا ہے کہ مسلمان معاشروں میں دین دار عناصر کو ابھرنے نہیں دینا اور کسی مسلمان ملک میں شریعت نافذ نہیں ہونے دینی۔ چنانچہ پاکستان، انڈونیشیا، ملائیشیا اور دوسرے بیسیوں ممالک میں اس نے دینی عناصر کو پرامن سیاسی جدوجہد میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور ان کو ہرانے کے لیے اس نے ہر طرح کے ہتھکنڈے اختیار کیے اور سازشیں روا رکھیں اور اس کے باوجود اگر وہ اپنے زور بازو سے پرامن سیاسی جدوجہد میں کامیاب ہو گئے (جیسے الجزائر، فلسطین اور مصر وغیرہ میں) تو انہیں اقتدار میں نہیں آنے دیا یا کھل کر کام نہیں کرنے دیا (جیسے ایران، افغانستان اور ترکی وغیرہ میں)۔

اہل مغرب کے علاوہ اس میں دوسرا بڑا منفی کردار مسلم حکمرانوں کا ہے جو ڈالروں اور اقتدار کے عوض مغرب کے گماشتہ کا کردار ادا کرنے پر بسہولت تیار ہو جاتے ہیں اور ریاست کے سارے ذرائع اور

قوت ان دین دار مسلمانوں اور جماعتوں کو کچلنے پر لگا دیتے ہیں بلکہ اس کے بھی شواہد موجود ہیں کہ خود مغرب کی خفیہ ایجنسیاں اس طرح کی انتہا پسند مسلم تنظیموں کو بالواسطہ ڈالر، اسلحہ اور تربیت مہیا کرتی ہیں اور انہیں مسلم معاشرے سے جدال پر ابھارتی ہیں گویا خود مغرب ان کو پروموٹ کرتا ہے۔

لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ مسلم افراد اور جماعتوں کو انتہا پسند اور دہشت گرد بنانے کے ذمہ دار دو عناصر ہیں: ایک مغرب اور دوسرے ان کے حمایتی مسلمان گماشتہ حکمران۔ اگر یہ دونوں محرکات ختم ہو جائیں تو ہمیں یقین ہے کہ مسلمانوں کے دین دار عناصر میں انتہا پسندی کے رجحانات پیدا ہی نہیں ہوں گے اور اگر بالفرض پیدا ہوں بھی تو انہیں موزوں تعلیم و تلقین اور مکالمے سے کم اور ختم کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا ہم مسلمان عامۃ الناس سے عرض کرتے ہیں کہ وہ معاملات کو صحیح تناظر میں سمجھنے کے لیے مندرجہ بالا حقائق پیش نظر رکھیں (خصوصاً پاکستان میں جاری فوجی آپریشن کو سمجھنے کے لیے) اور ان علماء و فقہاء سے بیان اور فتوے جاری کرنے میں احتیاط کی درخواست کرتے ہیں جو اہل مغرب اور ان کے گماشتہ حکمرانوں اور اداروں کی حمایت میں ان ''انتہا پسندوں اور دہشت گردوں'' کی مذمت کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ڈالروں اور روپوں میں بڑی طاقت ہے لیکن اس 'کثیر' کو، خواہ یہ جتنا بھی کثیر ہو، اللہ نے ''ثمن قلیل'' ہی کہا ہے اور آخرت میں تو یہ 'لکھ''[1] یقیناً 'ککھ'[2] بھی ثابت نہ ہوں گے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

اعتذار

تعلیم والی بحث، اس خواہش میں کہ ایک ہی بار نمٹ جائے، طویل ہو گئی جس سے صفحات بڑھانے کے باوجود دوسرے مضامین مختصر بھی کرنا پڑے اور کئی اہم مضامین شامل ہونے سے رہ بھی گئے۔ حافظ کاظم عثمان صاحب کا اسلام اور مغرب پر، عمر جاوید صاحب کا دینی تحریکوں پر اور عزیز مرزا صاحب کا تعلیم پر مضمون ان شاء اللہ اگلے شمارہ میں شامل ہوگا۔

---

۱) لاکھ ۲) پرکاہ

تعلیم و تربیت　　　　ڈاکٹر محمد امین

پاکستان کی مغرب زدہ تعلیم
اور اس کی اسلامی تشکیل نو کا مسئلہ

جناب محمد وقاص خاں اور ان کے ہم خیال احباب کی خدمت میں چند گزارشات

کراچی کے بعض اسلامی سکولوں کی طرف سے یہ بات اٹھائی گئی کہ جو نسل وہ تیار کر رہے ہیں ان پر اسلامی فکر و تہذیب کی بجائے مغربی فکر و تہذیب کی چھاپ کیوں ہے؟ خالد جامعی صاحب نے اس کے جواب میں ان کے نصاب کی طرف اشارہ کیا کہ اگر علم مغرب زدہ ہوگا اور اسلام کی عکاسی نہیں کرے گا تو پھر مغرب زدہ ذہن ہی تیار ہوگا۔ اس پر ہم نے البرہان کے مئی کے شمارے میں واضح کیا کہ ہمارے اسلامی سکول 'اسلامی تعلیم' کے نام پر بعض ظاہری اور ہلکے پھلکے اقدامات تو کرتے ہیں لیکن اسے موثر اور حقیقی معنوں میں اسلامی بنانے کے لیے سنجیدہ اقدامات نہیں کرتے اور خصوصاً مغربی فکر و تہذیب کی تعلیمی روایات و اقدار کو رد نہیں کرتے جس کے منطقی نتیجے میں مغرب زدہ نسل تیار ہو رہی ہے۔ ہمارا نقطۂ نظر واہ کینٹ کے جناب محمد وقاص خاں صاحب کو پسند نہیں آیا (جو مرکزی مجلس شوری جماعت اسلامی پاکستان کے رکن بھی ہیں) اور انہوں نے البرہان کے جون کے شمارے میں ہماری رائے پر تنقید کرتے ہوئے اسے انتہا پسندی پر محمول کیا۔ اسی شمارے میں جماعت اور تنظیم اساتذہ پاکستان کے ایک معروف ماہر تعلیم جناب پروفیسر ملک محمد حسین صاحب نے ان کے نقطۂ نظر کی بجائے ہمارے خیالات کی تائید کی۔ ملک صاحب چونکہ جماعت کے فکری دائرے کے اندر کے آدمی ہیں اور ان کے مخاطب بھی جماعت کے اندر کے آدمی تھے لہٰذا یوں محسوس ہوا جیسے ہدف جماعت اسلامی کے لوگوں کے سکول اور تعلیمی ادارے تھے حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ خالد جامعی صاحب اور میں نے ایک عمومی بات کی تھی اور اپنی موجودہ گزارشات میں بھی ہم اصولی اور عمومی بات ہی کریں گے۔

وقاص صاحب نے پاکستان کی مغرب زدہ تعلیم پر ہمارے تبصرے کو پسند نہیں کیا تو ہماری رائے میں اس کی فکری وجہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے حوالے سے ہمارے اور ان کے رویے میں فرق ہے۔ ہم مغربی فکر و تہذیب کو الحاد اور گمراہی پر مبنی اور خلاف اسلام سمجھتے ہیں لہٰذا اسے رد کرنا چاہتے ہیں جب کہ ان کا رویہ اس کے بارے میں نرم ہے۔ اور تعلیم چونکہ نتیجہ ہوتی ہے کسی قوم کے عقائد، ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم کا

لہٰذا تعلیم پر گفتگو سے پہلے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب کے بارے میں ہمارا جو نقطۂ نظر ہے پہلے ہم اس پر گفتگو کر لیں تا کہ مغربی طرز کی تعلیم پر ہمارے نقد کے جواز کی بنیاد سامنے آ سکے۔

مغربی تہذیب کیا ہے؟ اس کی فکری بنیادیں کیا ہیں؟ کیا یہ اسلام سے مختلف و متضاد ہے؟ کیا اہل مغرب اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں؟ مسلمانوں کو مغربی تہذیب کو ردّ کرنا چاہیے یا قبول کرنا چاہیے؟ کلی طور پر ردّ کرنا چاہیے یا اس سے کچھ استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے؟ ان سوالات پر ہم نے برسوں غور کیا ہے اور ان پر تفصیل سے لکھا ہے چنانچہ ہماری کتابوں (۱۔ ’اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش‘ ۲۔ مسلم نشأۃ ثانیہ: اساس اور لائحہ عمل، اور ۳۔ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل) میں ان سوالات کے واضح اور تفصیلی جوابات موجود ہیں۔ ۵۶ صفحات کے ایک ماہانہ رسالے (البرہان) میں، جس میں بعض دوسرے مضامین بھی ہوتے ہیں، کسی موضوع پر طویل اور سیر حاصل بحث ممکن نہیں ہوتی اور اگر اجمال سے کام لیا جائے تو تفہیم کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں...... لہٰذا جو احباب ان موضوعات پر ہمارا موقف تفصیل سے جاننا چاہتے ہوں، وہ البرہان سے مذکورہ کتابیں منگوا کر دیکھ لیں۔ یہاں ہم کوشش کریں گے کہ دو حصوں میں اپنے جواب کو سمیٹ لیں ایک میں مغربی تہذیب کے حوالے سے گفتگو ہو گی اور دوسرے میں ہم تعلیم کے مغرب زدہ ہونے اور اس کی اسلامی تشکیل نو کے بارے میں کچھ عرض کریں گے وباللہ التوفیق۔

حصہ اول: مغربی تہذیب: اسلام اور مسلمانوں کے لیے فتنہ اور چیلنج

مغربی تہذیب ہے کیا؟

انسان جب سے اس دنیا میں آیا ہے جب وہ سن شعور کو پہنچتا ہے تو اس کے سامنے یہ سوالات آ کھڑے ہوتے ہیں کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اسے زندگی کیسے گزارنی چاہیے؟ اور انسان چونکہ مدنی الطبع ہے اکیلا نہیں رہتا بلکہ مل جل کر، معاشرہ بنا کر رہتا ہے لہٰذا وہ یوں سوچتا ہے کہ اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کن اصولوں کے مطابق گزارنی چاہیے؟ انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے ان سوالوں کے جو جوابات دیے ہیں وہ بنیادی طور پر دو قسم کے ہیں: **ایک** گروہ انسانی کا خیال ہے کہ اسے ایک بالاتر ہستی (اللہ) نے پیدا کیا ہے لہٰذا اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ کی ہدایت کے مطابق گزارنی چاہیے۔ انسانی سلوک (Behavior) دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے ایک فکر اور دوسرے عمل۔ چنانچہ یہ گروہ اپنی اصطلاح میں انسانی سوچ اور فکر سے متعلق الٰہی رہنمائی کو ’عقیدہ‘ اور انفرادی اور اجتماعی اعمال میں اللہ کی رہنمائی کو ’شریعت‘ کہتا ہے اور دونوں مل کر ’دین‘ کہلاتے ہیں۔ دوسرا انسانی گروہ وہ

ہے جو یہ سوچتا ہے کہ انسان خود شعور و عقل اور بصری و سمعی صلاحیتیں رکھتا ہے لہٰذا انسانی عقل اور اس کا تجربہ و مشاہدہ اسے انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کی راہ سجھاتا ہے۔ اس کی اصطلاح میں فکری پہلو 'ورلڈ ویو' اور انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کا عمل 'تہذیب' کہلاتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ عقیدہ اور ورلڈ ویو دراصل ایک ہی چیز ہیں اور دونوں انسانی اعمال کی فکری بنیادوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور اسی طرح شریعت/دین اور تہذیب ایک ہی چیز ہیں کیونکہ دونوں انسان کے انفرادی و اجتماعی سلوک کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان میں فرق صرف تسمیات کا ہے۔ انسانی فکر و عمل کا منبع اگر وحی الٰہی ہو تو وہ عقیدہ و شریعت/دین کہلاتا ہے اور انسانی فکر و عمل کا منبع اگر خود انسانی عقل و شعور اور اس کا تجربہ و مشاہدہ ہو تو یہ 'ورلڈ ویو' اور 'تہذیب' کہلاتا ہے۔ اصطلاحات و تسمیات سے قطع نظر فنکشن دونوں کا ایک ہی ہے یعنی انسانی فکر و عمل کی رہنمائی۔

پہلا گروہ چونکہ اللہ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے لہٰذا اس کے رویے کو 'اسلام' اور خود اسے 'مسلم' کہا جاتا ہے اور جو لوگ اس طرز عمل کو نہیں مانتے ان کو 'غیر مسلم' (اللہ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم نہ کرنے والا) اور 'کافر' (حق کا انکار کرنے والا) کہا جاتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کے فکر و عمل میں تھوڑی بہت مشابہت ہو سکتی ہے لیکن اپنی اصل میں مختلف ہونے کی وجہ سے دونوں کے فکر و عمل میں اختلاف و تضاد نمایاں ہوتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان دونوں گروہوں کے طرز عمل اور نظام ہائے حیات کے اختلاف و تضاد کا تجزیہ کریں، مناسب محسوس ہوتا ہے کہ پہلے ہم ان کی فکر کا تقابلی مطالعہ کر لیں۔ پہلے گروہ کی عصر حاضر میں نمائندگی 'اسلام' اور 'مسلمان' کرتے ہیں اور دوسرے گروہ کی سب سے بڑی نمائندہ مغربی تہذیب اور اس کا ورلڈ ویو ہے۔

مسلم عقیدہ

مسلمانوں کے عقیدے کی اساس تین نکات ہیں: توحید، رسالت اور آخرت۔

توحید: یہ ہے کہ صرف ایک اللہ انسان اور اس کائنات کا خالق و مالک و معبود و پروردگار ہے، اسے زندگی اور موت دینے والا اور اس کے نفع و نقصان پر قادر ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا، سنتا اور سمجھتا ہے۔
رسالت: یہ ہے کہ انسان اللہ کا عبد ہے اور اللہ انسان کو یہ سکھانے کے لیے کہ وہ اس کی عبادت و اطاعت کی زندگی کیسے گزارے، خود انسانوں ہی میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے اسے براہ راست اپنی ہدایت سے نوازتا ہے اور لوگوں کے لیے بطور ماڈل اور نمونہ بنا کر پیش کرتا ہے تا کہ اسے دیکھ کر وہ اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ **آخرت** کا تصور یہ ہے کہ یہ دنیا عارضی اور دار الامتحان ہے۔ اس دنیا

کے بعد ایک اور غیر فانی عالم ہوگا جس میں دنیا کی زندگی کے اچھے یا برے اعمال کی جزا وسزا دی جائے گی۔ جنھوں نے دنیا کی زندگی اللہ کی عبادت واطاعت میں گزاری ہوگی اللہ ان سے راضی ہوگا اور انہیں اپنی نعمتوں سے نوازے گا اور جنھوں نے دنیا کی زندگی اس کے برعکس گزاری ہوگی ان سے وہ ناراض ہوگا اور وہ سخت عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔

مغربی تہذیب کی فکری اساسات

چونکہ مغربی تہذیب آسمانی ہدایت پر یقین نہیں رکھتی اس لیے اس تہذیب کی فکری اساسات ان تحریکوں کی مرہون منت ہیں جو ان کے فلسفیوں اور دانشوروں نے ان کے معاشروں میں برپا کیں۔ اہل مغرب اپنی تہذیب کے بنیادی افکار یا اپنے اس دین کے عقائد (اگر چہ یہ تہذیب اپنے لیے دین یا مذہب کا لفظ استعمال نہیں کرتی کیونکہ ان لوگوں نے بڑی جدوجہد سے پوپ گردی سے نجات پائی تھی جو دین آسمانی کے نام پر ان کا صدیوں سے سیاسی، معاشی اور معاشرتی استحصال کر رہے تھے؛ اور مذہب کے ساتھ آسمانی ہدایت کا تصور چسپاں ہے جب کہ وہ اس کے منکر تھے) کی جگہ ورلڈ ویو کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس میں اپنے تصور انسان، تصور کائنات اور تصور الہ کو زیر بحث لاتے ہیں۔

ان افکار کا اگر ہم مطالعہ کریں تو انہیں اسلامی عقائد کے برعکس اور ان سے متضاد پاتے ہیں لیکن بدقسمتی سے مسلم معاشروں میں مطالعۂ مغرب کی روایت جڑ نہیں پکڑ سکی اور ہماری یونیورسٹیوں اور دینی مدارس میں اس کی تدریس کا کوئی انتظام نہیں اور نہ ہمارے تحقیقی اداروں میں مغربی علوم وسٹریٹیجیز کے تجزیے وتحقیق کا کوئی اہتمام ہے (ہماری ذہنی غلامی، نالائقی اور بے حسی کے علاوہ ممکن ہے اس کے پیچھے مغرب کی خواہش اور سازش بھی کارفرما ہو) جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سارے عالم اسلام میں ایک بھی 'مرکز برائے مطالعہ مغرب' موجود نہیں۔ بہرحال، ہم یہ کہنا چاہتے تھے کہ مغربی تہذیب کے بنیادی افکار، جنھوں نے اس تہذیب کی تشکیل وصورت گری کی ہے، ان کے تین بڑے منابع ومصادر ہیں: **ایک** مغرب کے بڑے مفکرین ودانشوروں کے حالات وافکار کا مطالعہ جیسے بیکن، کانٹ، نٹشے، ہیگل، روسو، ڈارون، فرائیڈ وغیرہ۔ **دوسرے** مغرب کی اہم فکری تحریکوں کا مطالعہ جیسے تحریک نشأۃ ثانیہ (Renaissance)، تحریک اصلاح مذہب (Reformation)، تحریک تنویر یا تحریک روشن خیالی (Enlightenment)، تحریک جدیدیت (Modernity) اور تحریک پس جدیدیت (Post-Modernity) وغیرہ۔ **تیسرے** مذکورہ فلاسفہ/دانشوروں اور فکری تحریکوں کے پیدا کردہ اہم نظریات جیسے ہیومنزم (Humanism)، سیکولرزم (Secularism)، کیپٹل ازم

(Capitalism) سائنٹسزم (Scienticism) ، لبرلزم (Liberalism)، میٹریل ازم (Materialism) وغیرہ۔ مغربی زبانوں ،خصوصاً انگریزی میں، مغربی تہذیب کے ان مصادر پر بلاشبہ کروڑوں کتابیں، لاکھوں جرائد، ہزاروں ویب سائٹس اور سیکڑوں انسائیکلو پیڈیاز موجود ہیں۔ معلومات کے اس سمندر سے چند مچھلیاں پکڑنا کارے دارد ہے۔ہم نے قارئین کی سہولت کے لیے اپنی کتاب 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش' میں مطالعۂ مغرب کے لیے انگریزی اور اردو کتابیات کی ایک فہرست مہیا کی ہے جس میں غیر مسلم اور مسلم مفکرین کی اہم کتابیں شامل ہیں۔ البرہان نے بھی اپنی زندگی کے پہلے چار سالوں (۲۰۱۰ء تا ۲۰۱۴ء) میں اس موضوع پر وقیع مضامین شائع کیے ہیں۔ یہاں ہم اختصار کی خاطر مغربی تہذیب کے فکری منابع میں سے اس کے چند اہم نظریات کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے:

ہیومنزم: جس کا ترجمہ 'انسان پرستی' کیا جاسکتا ہے، کا آغاز سولھویں صدی میں تحریک سأۃ ثانیہ سے ہوا جس کی ابتداء احیائے علوم قدیمہ (فاسدہ یونانیہ و رومیہ) اور اس تصور سے ہوئی کہ انسان اس کائنات میں مرکزی اور اہم ترین حیثیت رکھتا ہے اور جس کی انتہا اس پر ہوئی کہ بقول نیٹشے ، خدا مر چکا ہے،(۱) اور بقول سارتر 'خدا ایک عفریت ہے جسے ہم زندہ نہیں ہونے دیں گے کیونکہ ہم نے انسان کی مکمل آزادی اور خودمختاری کا ہدف بڑی مشکلوں سے حاصل کیا ہے(۲)۔ یوں ہیومنزم نے خدا کی بجائے انسان کو اپنا خدا خود بنا دیا ہے اور اسے خودمختار ہی نہیں بلکہ مختار مطلق بنا کر دم لیا ہے۔

لبرلزم اسی ہیومنزم کی پیداوار ہے کہ انسان آزاد اور خودمختار ہے جو چاہے سوچے، جس خیال کا چاہے اظہار کرے (خدا، پیغمبروں اور مقدس کتابوں کی توہین کا حق، فحاشی، عریانی اور بے دینی پھیلانے کا حق)، وہ سیاسی معنوں میں حاکم اعلیٰ (Sovereign) ہے لہٰذا عوام جس کو چاہیں اپنا نمائندہ بنائیں اور جو قانون اس کے نمائندے چاہیں بنائیں (چنانچہ مغرب کی پارلیمنٹیں شراب نوشی، جوئے، زنا، ہم جنسی وغیرہ کو حلال اور قانونی قرار دے چکی ہیں) معاشرتی لحاظ سے جو چاہیں پہنیں اور جو چاہیں اتار دیں، جس کے ساتھ چاہیں نکاح کیے بغیر زندگی گزاریں، حرام کے بچے پیدا کریں اور......اور)

سیکولرزم: ہیومنزم جس معاشرے میں ابھرا بہرحال وہ ایک روایتی عیسائی معاشرہ تھا چنانچہ

---

1) Frederick Nietzsche. *The Gay Science,* trans.&ed. Walter Kaufmann, [New York: Vintage, 1974] part III, sec. 125 (The Mad Man), 181)

2) Jean Paul Sartre, *Existentialism as Humanism,* P.284 (Tr.Philip Mairet) Routledge, London, 1997.

ہیومنزم سے خدا، وحی اور مذہب کی جو نفی ہوتی تھی اس نے معاشرے میں ارتعاش پیدا کیا تو سیکولرزم کا نظریہ سامنے لایا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ جس کسی نے اللہ اور مذہب کو ماننا ہے وہ اپنی ذاتی زندگی میں مان لے لیکن معاشرے اور ریاست کی اجتماعی زندگی میں بہرحال خدا اور مذہب کا کوئی کردار تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح خدا اور مذہب کو ذاتی زندگی کے ایک محدود دائرے میں دھکیل کر غیر موثر کر دیا گیا اور معاشرے و ریاست کی اجتماعی زندگی کے سارے شعبوں میں انسانی خدائی کا ڈنکا بجا دیا گیا(۱)۔

اگرچہ سیکولرزم بظاہر خدا اور مذہب کا انکار نہیں کرتا لیکن مسلمان ادیب اور دانشور اس لیے اس کا ترجمہ'لادینیت' کرتے ہیں کہ جب انسان نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ خدا کا اختیار کہاں تسلیم کرے اور کہاں تسلیم نہ کرے تو دین کہاں رہا؟ کیونکہ اسلام تو نام ہی اللہ ہی کی غیر مشروط اطاعت کا ہے اور جب اللہ کی اطاعت ہی انسانی مرضی سے مشروط ہوگئی تو کہاں کا دین اور کہاں کا اسلام؟

کیپٹل ازم: کا ترجمہ اردو میں نظام سرمایہ داری سے کیا جاتا ہے اور اسے بالعموم ایک معاشی نظام سمجھا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک معاشی نظام نہیں بلکہ ایک پورا نظام فکر اور نظام زندگی ہے۔ اس نظریے کی رو سے دنیا ہی سب کچھ ہے۔ یہی خدا ہے اور یہی معیارِ حق اور معیارِ عزت ہے۔ اسی کے لیے انسان کو ساری تگ و دو کرنی چاہیے۔ حبّ دنیا، حب جاہ و مال اور ہر قیمت پر جمع مال کی حرص و ہوس اس نظریے کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہاں تک کہ کیپٹل ازم تقاضا کرتا ہے کہ حکومت کو بھی اس کے افعال میں مداخلت کا حق نہیں بس پیسہ آنا چاہیے، جہاں سے بھی آئے، جیسے بھی آئے۔ نہ حلال کی طلب، نہ حرام کا فرق۔ سود حلال، سٹہ جائز اور معیار زندگی ہر قیمت پر بلند ہونا چاہیے۔ راتوں رات امیر بننے کی خواہش بری ہے اور نہ دوسروں کو دھکا دے کر، گرا کر، آگے بڑھنا مذموم ہے۔ بس دنیا کی سہولتیں، آسائشیں، کار کوٹھی، بنک بیلنس...... یہی زندگی میں مطلوب ہے اور اسی کی قدر و وقعت ہے۔ نہ اس میں آخرت کی ترجیح کی کوئی صورت ہے اور نہ اخلاقی اصول وضوابط کی اور نہ الٰہی ہدایت کی۔ میٹریلزم یا مادہ پرستی بھی اسی نظام سرمایہ داری کا شاخسانہ ہے(۲)۔

---

1) John Summerville, *The Secularization of Early Modern England*, Oxford, 1992, p.8
Encyclopaedia of Religion and Ethics,s.v. Secularism, vol.II,p-347.

2) B. Russell, s*History of Western Philosophy*, George Allen and Unwin, London, 1967, p-23.

سائنٹسزم: سائنٹسزم یا ایمپر یسزم کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان خودمختار ہے تو اپنی عقل استعمال کر کے وہ اپنے سارے مسائل خود حل کر سکتا ہے۔ اسے خدا، وحی اور مذہب کی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ حقیقی علم وہ ہے جو انسان کو تجربے اور مشاہدے کے نتیجے میں حاصل ہو کیونکہ لیبارٹری میں اس کو دہرا کر اس کے نتائج کا تجربہ کیا جا سکتا ہے اور اسے صحیح یا غلط ثابت کیا جا سکتا ہے جب کہ مذہبی عقائد تو خدا کے جبر کی وجہ سے ماننے پڑتے ہیں۔ اسی لیے انہیں Dogma کہا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اس نظریہ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اور سائنسی منہاج علم کو مذہبی اور عمرانی علوم کے شعبوں پر بھی حاوی کر دیا[1]۔

مسلمان بجاطور پر اس نظریے کو انکار وحی کے مترادف مانتے ہیں کیونکہ یہ منہاج وحی کی صداقت کو بھی اپنے ترازو میں تولتا اور اسے رد کرتا ہے اور الٰہی ہدایت کی برتری کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ مغرب کے فلسفۂ تعلیم (Epistemology) پر اس نظریے نے خاطر خواہ اثرات ڈالے ہیں اور سائنسی منہاج کو علم حقیقی کا منبع قرار دے کر اس نے مذہب اور عمرانی علم پر بھی اسے غالب کر دیا ہے۔

مغرب کا ورلڈ ویو: ان افکار سے مغربی تہذیب کے علم برداروں کا ورلڈ ویو واضح ہو جاتا ہے ان کے نزدیک تصور انسان یہ ہے کہ انسان خودمختار بلکہ مختار مطلق ہے، وہ اپنے بارے میں اور اپنی اجتماعی زندگی کے بارے میں جو فیصلے چاہے کر سکتا ہے گویا وہ اپنا خدا خود ہے اور کسی خدا کا عبد نہیں ہے۔ ان کا تصور الٰہ اور مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنی ذاتی زندگی میں خدا کو ماننا چاہتا ہے تو مان لے لیکن اجتماعی زندگی میں اس خدا کی کوئی بات نہیں مانی جائے گی اور یہاں عوام کی رائے ہی فیصلہ کن ہو گی۔ گویا یہ فیصلہ کرنا فرد (یعنی عوام) کی اتھارٹی ہے کہ وہ خدا کی کون سی بات مانے اور کون سی نہ مانے۔ اسی طرح ان کا تصور کائنات یہ ہے کہ زندگی بس اس دنیا ہی کی زندگی ہے، یہی اہم ہے اور یہی ہماری تگ و تاز کا ہدف ہونی چاہیے۔ اسی کی بہتری اور یہاں سہولتوں اور آسائشوں کا حصول ہی ہماری ساری کوششوں کا مرکز ہونا چاہیے، رہی آخرت تو وہ کس نے دیکھی ہے۔ اسی طرح یہ تہذیب وحی اور آسمانی ہدایت کے منبع علم ہونے کا انکار کرتی ہے۔ اس کے نزدیک حق اور حقیقی علم صرف وہ ہے جو انسانی عقل اور تجربہ و مشاہدہ کی پیداوار ہو اور جس کے صحیح ہونے کا ثبوت معمل (لیبارٹری) میں دیا جا سکتا ہو۔

اس ورلڈ ویو کا خلاصہ یہ ہے: خدا اور اس کی کبریائی کا انکار، انسان کا خدا کا عبد نہ ہونا بلکہ اپنے فیصلے

---

1) Hume, David, An Enquiry Concering the Principle of Morals London,

1939, p-289.

کرنے میں خود مختار ہونا۔ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنا اور اسے آخرت پر ترجیح دینا۔ رسالت، وحی اور الٰہی ہدایت کا انکار اور عقل وحواس سے حاصل ہونے والے علم کو حتمی معیار سمجھنا۔

مغربی تہذیب: ایک نظامِ حیات

ان افکار نے عملی زندگی میں جن اجتماعی اداروں اور رویوں کو جنم دیا ہے ان میں سے چند اہم یہ ہیں:

معاشرت: فرد کی لامحدود آزادی۔ عورت اور مرد کی مساوات، عورت کو حق نکاح اور حق طلاق بلکہ بغیر نکاح کے مرد کے ساتھ رہنے اور بچے پیدا کرنے کی آزادی۔ لباس کی آزادی کہ جو چاہے پہنے اور نہ چاہے تو نہ پہنے، ہم جنسیت کی آزادی، محارم اور جانوروں کے ساتھ بھی زنا کی آزادی۔ بزرگوں کی تکریم کا خاتمہ اور ان کی اولڈ ہومز میں رہائش۔ عورتوں کی بچے پیدا کرنے اور پالنے میں مزاحمت۔ خاندان کی ٹوٹ پھوٹ بلکہ خاتمہ۔

سیاست

حاکمیت اعلیٰ (Sovereignty): فرد اور عوام حاکم اعلیٰ ہیں نہ کہ خدا اور اس کا قانون۔

جمہوریت: فرد چونکہ خود مختار ہے لہٰذا اس کے نمائندے بھی خود مختار ہیں اور پارلیمنٹ سب پر بالادست ہے۔ حلال وحرام کا فیصلہ خود کرسکتی ہے اور جو قانون چاہے بنا سکتی ہے۔ چنانچہ مغرب میں شراب نوشی، جوا، زنا، ہم جنسیت سب جائز اور قانونی ہیں۔ انسانوں کا بنایا ہوا آئین مقدس ہے۔

نیشنلزم: قومیت کی بنیاد نسل، زبان، رنگ اور خطے کا اشتراک ہے۔ وطن مقدس ہے اور معیار حق و باطل ہے۔ اسی کی خاطر جنگیں لڑی جاتی ہیں اور اس کے مفاد پر سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے یہاں تک کہ عزت اور اخلاق بھی۔

معیشت: چونکہ دنیا ہی سب کچھ ہے لہٰذا ہر قیمت پر یہاں کی کامیابی اور خوشحالی مطلوب ہے لہٰذا حب دنیا اور حب جاہ و مال محمود ہے۔ سود لینے دینے میں کوئی قباحت نہیں۔ لامحدود منافع اندوزی تجارت کا ہدف ہے یہاں تک کہ حکومت کو بھی اس میں مداخلت کی اجازت نہیں۔ معیارِ زندگی بلند کرنے کی دوڑ ضروری ہے اور راتوں رات امیر بننے کی خواہش میں کوئی برائی نہیں۔

قانون: اپنے لیے قانون بنانا انسانوں کا حق ہے۔ خدا کے قانون کی کوئی حیثیت نہیں لہٰذا

آئین مملکت اور قانون پارلیمنٹ بناتی ہے جسے چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

طوالت سے بچنے کی خاطر ہم ان چند شعبہ ہائے حیات کے مختصر ذکر پر کفایت کرتے ہیں۔

مغربی تہذیب دین غیر اللہ ہے

مغربی تہذیب کے ان اساسی افکار سے واضح ہے کہ اس تہذیب کا ورلڈ ویو اسلامی عقائد سے متضاد ہے اور اس ورلڈ ویو کی بنیاد پر اجتماعی زندگی (یعنی معاشرت، معیشت، سیاست، قانون...... وغیرہ کے شعبوں) میں جو ادارے مغربی تہذیب کے علمبردار ممالک نے بنائے ہیں، وہ اسلامی تعلیمات و احکام کے نقیض، مخالف اور ان سے متضاد ہیں۔ لہٰذا مسلمان مجبور ہیں کہ اسے دین غیر اللہ سمجھیں اور رد کریں کیونکہ انہیں یہی حکم دیا گیا ہے:

۱۔ وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (آل عمران، ۳: ۸۵) ''اور جو کوئی دین اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کے دین کو ہرگز قبول نہ کرے گا اور وہ آخرت میں گھاٹے میں رہے گا۔''

۲۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِهٖ وَ یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (النساء ۴: ۶۰)۔ ''تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔''

۳۔ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَی اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُکَذِّبِیْنَ (النحل ۱۶: ۳۶) ''ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ 'اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو، اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہوگئی۔ پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔''

۴۔ وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ ... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ...... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدہ ۵: ۴۴-۴۷) یعنی ''جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں...... وہی ظالم ہیں...... وہی فاسق ہیں۔''

۵۔ فَاَقِمۡ وَجۡهَکَ لِلدِّیۡنِ حَنِیۡفًا فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (الروم ۳۰:۳۰) ''پس (اے نبی اور نبی کے پیروؤ) یک سو ہوکر اپنا رُخ اس دین کی سمت میں جما دو اور قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی انسانی فطرت بدلی نہیں جا سکتی، یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

۶۔ قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّنۡ دِیۡنِیۡ فَلَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِیۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلٰکِنۡ اَعۡبُدُ اللّٰهَ الَّذِیۡ یَتَوَفّٰکُمۡ وَاُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ [104:10] وَاَنۡ اَقِمۡ وَجۡهَکَ لِلدِّیۡنِ حَنِیۡفًا وَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (یونس ۱۰:۱۰۴، ۱۰۵) یعنی ''اے نبی، کہہ دو کہ لوگو! اگر تم ابھی تک میرے دین کے متعلق کسی شک میں ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی بندگی کرتے ہو میں ان کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اسی خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمہاری موت ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں اور یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک اس دین پر قائم کر دوں، اور ہر گز ہر گز مشرکوں میں سے نہ ہوں۔''

مغربی تہذیب کو ردّ کرنے کے مزید دلائل

اگرچہ مغربی تہذیب کو ردّ کرنے کے لیے ایک مسلمان کے لیے مندرجہ بالا بنیادی بات ہی کافی ہے کہ یہ کفر ہے، دینِ غیر اللہ ہے اور کسی مسلمان کے لیے بحالتِ ایمان یہ جائز نہیں کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر اس کی الحادی فکر کو مانے اور اس کی خلاف اسلام تعلیمات پر عمل کرے۔ تاہم اس کے علاوہ بھی کئی اور اسباب اور وجوہ ایسی ہیں جو تقاضا کرتی ہیں کہ مسلمان مغربی فکر و تہذیب کو ردّ کر دیں مثلاً:

۱۔ قرآن وسنت کی تعلیمات

جو قومیں اس الحادی مغربی فکر و تہذیب کی پیرو ہیں ان کی اکثریت یہود و نصاریٰ پر مشتمل ہے۔ یہ اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل کریں یا نہ کریں، اس کے لیے شدید تعصب ضرور رکھتی ہیں اور مسلمانوں کو اپنا حریف اور دشمن سمجھ کر ان سے نفرت و انتقام کے جذبات ہمیشہ سے رکھتی رہی ہیں۔ چنانچہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کو ان سے دور رہنے اور ان کی سازشوں سے بچنے کی شدید تلقین کی ہے۔ اس ضمن میں چند آیات و احادیث درج ذیل ہیں:

۱۔ ''وَلَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَهُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ قُلۡ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰی وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ الَّذِیۡ جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَکَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ'' (البقرہ ۲:۱۲۰)

''یہودی اور عیسائی اس وقت تک تم سے راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کا مذہب نہ اختیار کرلو۔ان سے کہو کہ اللہ کی ہدایت ہی سچی ہدایت ہے اور اگر تم اللہ کی طرف سے صحیح علم آ جانے کے بعد بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو اللہ کے مقابلے میں تمہارا نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔''

۲ - ''يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ [118:3] هٰاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ [119:3] اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ'' (آل عمران ۳: ۱۱۸۔۱۲۰) ''اے ایمان والو غیر مسلموں کو (یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو، کیونکہ سابقہ آیات میں انہی کا ذکر ہے) اپنا راز دار نہ بناؤ۔ وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ تم مشکل میں پڑو۔ان کی دشمنی ان کی باتوں سے ظاہر ہے اور جو بغض تمہارے لیے ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔تم ان سے دوستی رکھتے ہو مگر وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے۔ جب وہ تم سے الگ ہو کر آپس میں ملتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے سے اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔اگر تمہارے حالات اچھے ہوں تو انہیں رنج ہوتا ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔اگر تم صبر سے کام لو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی سازشیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔''

۳- ''يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ'' (المائدہ ۵: ۵۱) ''اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ۔ وہ (صرف) ایک دوسرے کے دوست ہیں۔تم میں سے جو انہیں دوست بنائے گا وہ انہی میں شمار ہوگا۔ بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

احادیث

۱۔' خالفوا الیھود و النصاری' (۱) یہود و نصاری کی مخالفت کرو۔ [یہ الفاظ آپ ﷺ نے بہت سارے احکام کے سلسلے میں بطور اصول ارشاد فرمائے]۔

۲۔'لاتستضیؤ ابنار المشرکین' (۲) یعنی مشرکوں کی آگ سے آگ نہ جلاؤ [مطلب یہ کہ

---

۱ - مسند احمد بن حنبل، ج ۵ ۱، ص ۲۶۴، ۲۶۵

۲ - سنن نسائی، کتاب الزینة، باب لاتنقشوا علی خواتیمکم عربیاً

ان سے معاشرتی تعلقات نہ رکھو، ان کے قریب نہ رہو، ان کی محتاجی سے بچو]

۳۔ 'غیر المغضوب علیھم و لا الضالین' کی تفسیر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں(۱)[گویا ہم مسلمانوں کو حکم ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں اللہ سے دعا مانگیں کہ اے اللہ ہمیں یہود و نصاریٰ کی پیروی سے بچا]

۲۔ اہل مغرب کا رویہ اسلام اور مسلمانوں سے عملاً دشمنی کا ہے

یہود و نصاریٰ میں اسلام و مسلم دشمنی کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ عہد نبوی میں یہودیوں نے اسلام اور مسلمانوں کو ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کی سازشیں کیں جن کے نتیجے میں وہ مدینہ سے نکالے گئے۔ اس کے باوجود وہ باز نہ آئے تو خیبر میں کچلے گئے۔ نصاری کے حملوں کی ابتداء غزوۂ تبوک و موتہ میں ہوگئی تھی۔ صحابہ کرام نے ان کا پھن کچلا لیکن یہ بس گھولتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۴۵۳ء میں جب قسطنطنیہ فتح ہوا تو عیسائی رہنما پورے یورپ میں پھیل گئے اور مسلمانوں کے خلاف نفرت و انتقام کے شعلے بلند کرنے شروع کیے۔ صلیبی جنگیں بھی اسی کا مظہر تھیں بلکہ مغربی تہذیب کی سأۃ ثانیہ میں یہی جذبہ محرکہ کارفرما تھا جس کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں جب اتحادیوں نے فتح پائی اور مشرق وسطی کو فتح کر کے اس پر قبضہ کر لیا تو عیسائی اتحادی کمانڈر نے دمشق میں سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر کو ٹھڈے مارتے ہوئے کہا کہ اٹھو صلاح الدین! ہم آ گئے ہیں۔

اور ہمارے عہد میں، ہماری آنکھوں دیکھتے اور کانوں سنتے جو کچھ ہوا (اس کا انکار کون کر سکتا ہے سوائے اس کے جس کی آنکھوں پر مغربی فکر و تہذیب کی فکری غلامی کی پٹی بندھی ہو اور جس کے کان حق بات سننے کی صلاحیت کھو چکے ہوں) کہ بش نے افغانستان پر حملے کے وقت کروسیڈ (یعنی صلیبی جنگ) کا لفظ استعمال کیا (اگرچہ منافقانہ سیاست کی وجہ سے اور مسلمانوں اور دنیا کو دھوکہ دینے کی غرض سے اسے مستقل دہرایا نہیں گیا)، عراق، لیبیا اور افغانستان کو فوجی قوت سے بہیمانہ کچل دیا جب کہ شام، پاکستان، یمن اور مالی پر حملے جاری ہیں۔ مغرب کے یہود و نصاریٰ نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ کسی مسلمان ملک میں دین دار عناصر کو برسر اقتدار نہیں آنے دینا اور کسی کو شریعت نافذ نہیں کرنے دینی اور اگر کہیں دین دار عناصر پر امن سیاسی جدوجہد میں کامیاب بھی ہو جائیں (جیسے الجزائر، فلسطین اور مصر میں ہوا) تو انہیں حکومت نہیں کرنے دینی۔

۱- سنن ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب و من سورۃ فاتحۃ الکتاب

اس کے علاوہ مغرب میں جعلی قرآن تیار کر کے پھیلایا جارہا ہے۔قرآن کو دہشت گردی کا ذمہ دار قرار دے کر اعلان کر کے سرعام جلایا جاتا ہے۔پیغمبر اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امی) کے کارٹون بنائے جاتے ہیں، مستشرقین کی علمی تحریک کے ذریعے احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ناقابل اعتماد ثابت کیا جاتا ہے، مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے کے لیے اور مغرب میں اسلام کی اشاعت کو روکنے کے لیے ۹/۱۱ کا ڈرامہ رچایا جاتا ہے۔مسلمان ملکوں میں بے دینی، بداخلاقی، بے راہ روی، فحاشی، عریانی اور زنا کو مروج کرنے کے لیے ابلاغی یلغار کی جاتی ہے اور مسلمان میڈیا اس غرض سے استعمال کیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہود ونصاری اور مغربی فکر وتہذیب کے علم برداروں کا رویہ کل بھی اسلام اور مسلم دشمنی کا تھا اور آج بھی اسلام اور مسلم دشمنی کا ہے۔لہٰذا ان کی اور ان کی فکر وتہذیب کی حمایت کوئی مسلمان بحالت ایمان اور بحالت ہوش وحواس تو نہیں کر سکتا البتہ وہ شخص کر سکتا ہے جو بے حس، بے عقل اور دینی حمیت سے عاری ہو۔

۳۔مغربی فکر وتہذیب: مسلمانوں کے زوال سے نکلنے میں سب سے بڑی رکاوٹ

مسلمانوں کے زوال کے اسباب کی دو قسمیں ہیں: ایک داخلی اور دوسرے خارجی۔ بلاشبہ داخلی اسباب اہم تر ہوتے ہیں لیکن خارجی اسباب کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔مسلمانوں کے زوال کے داخلی اسباب میں سے سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اپنے نظریۂ حیات (اسلام) سے ان کی وابستگی کمزور پڑ گئی جس کی وجہ سے ان میں وہ صلاحیتیں ناپید ہو گئیں جو آخرت میں متوقع کامیابی کے ساتھ دنیا میں ترقی اور کامرانی کے لیے ضروری ہیں۔مسلمان جب اس حالت ضعف میں تھے اور ان کے قصر عظمت کی دیواریں ہل رہی تھیں تو مغربی قوتوں کا خارجی عنصر حرکت میں آیا اور اس نے اپنی سازشوں سے (مثلاً ترکوں اور عربوں کو لڑا کر اور ترک خلافت کو جنگ عظیم میں اپنے مخالف گروپ میں دھکیل کر اور......) اس ہلتی دیوار کو دھکا دے کر گرا دیا اور گھر پر ناجائز غاصبانہ قبضہ کر لیا۔

اہل مغرب سفاک، خود غرض اور بے رحم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت عیار اور ذہین بھی ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی صدیوں سے جمع شدہ دولت کی لوٹ کھسوٹ اور انہیں کچلنے اور غلام بنانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے برسوں امت مسلمہ کے غلبے کو برداشت کیا تھا اور اس کے اسباب پر غور کیا تھا لہٰذا اب انہوں نے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے غلام رکھنے کی منصوبہ بندی کی اور مسلمانوں کو، خصوصاً ان کے حکمرانوں اور بالا دست طبقات کو، اپنی فکری اور ذہنی غلامی میں مبتلا رکھنے کا سوچا۔اس کے لیے انہوں نے مسلمانوں کے قائم کردہ اجتماعی زندگی کے سارے اداروں (معاشرت، معیشت، سیاست، تعلیم،

قانون، عدلیہ......وغیرہ) کو تباہ و برباد کر دیا اور ان کی جگہ اپنی فکر و تہذیب کے مطابق نئے ادارے تعمیر کیے۔ اس کے لیے انہوں نے خصوصاً تعلیم و تربیت کے ادارے کو استعمال کیا (اس حوالے سے لارڈ میکالے کی ۱۸۳۲ء کی تعلیمی رپورٹ ایک کلاسیکل دستاویز ہے) کیونکہ ذہن سازی اور تعمیر شخصیت میں تعلیم ہی سب سے بنیادی کردار ادا کرتی ہے چنانچہ وہ مسلمانوں کو ذہنی غلام بنانے میں کامیاب ہو گئے اور چونکہ نام نہاد آزادی کے بعد بھی انہوں نے مسلمان ملکوں میں اقتدار انہی قوتوں کے سپرد کیا اور اس کے تسلسل کا انتظام کیا جو اس کی فکر و تہذیب سے مرعوب اور اس کے شائق تھے لہٰذا انہوں نے اس فکری غلامی کو مسلمان نسلوں میں منتقل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جس کا ایک مظہر آج یہ ہے کہ وہ شخص جس نے تیس کی دہائی میں اپنے دلائل سے مغربی فکر و تہذیب کے پرخچے اڑا دیئے (تنقیحات) اور اسلام پر اس کے اثرات کو ردّ کرتے ہوئے 'متکلم اسلام' کہلایا اور اس نے مغربی فکر و تہذیب کو اسلام کے مقابلے میں 'خالص جاہلیت' قرار دیا (پمفلٹ 'اسلام اور جاہلیت') آج اس کی اس قائم کردہ تحریک کا ایک رہنما ہم سے پوچھتا ہے کہ مغربی فکر و تہذیب کو غیر اسلامی قرار دے کر ردّ کرنے کے لیے تمہارے پاس دلیل کیا ہے؟

تو ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ آج مسلمان جب زوال اور غلامی کے قعر ذلت سے نکلنا چاہتے ہیں اور اسلام کی عظمت گم گشتہ کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں تو اسلام کے حق میں جدوجہد کرنے والے عناصر کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ مغربی فکر و تہذیب اور اس کے علم بردار ممالک ہیں۔ انہوں نے اپنی فکر و تہذیب کی یونیورسلائیزشن اور گلوبلائزیشن کے لیے اور خصوصاً مسلمان معاشروں میں مغربی فکر و تہذیب کے اصول و اقدار کی ترویج کے لیے کروڑوں اربوں ڈالرز کا بجٹ مختص کر رکھا ہے۔ اس کے لیے وہ تعلیم، میڈیا، کلچر، ثقافت، ادب کے سارے پرامن ذرائع، اپنے گماشتہ مسلم حکمرانوں کے ذریعے استعمال کرتے ہیں اور اگر ان میں ناکام ہو جائیں تو ننگی جارحیت پر آتے ہیں اور نفاذ اسلام کے خواہش مندوں کا تورا بورا بنا دیتے ہیں۔

مسلمان علماء اور مفکرین کی آراء

سطور بالا میں مغربی فکر و تہذیب کے بارے میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے کہ مسلمانوں کو اسے ردّ کر دینا چاہیے اور زوال کے دشت تیہہ سے باہر آنے کی جدوجہد میں مغربی فکر و تہذیب کے سراب کے پیچھے بھاگنے کی بجائے اسلام کا آب حیات نوش کرنا چاہیے، یہ ہماری کوئی انفرادی رائے نہیں ہے بلکہ جمہور مسلمان علماء، دانشور اور مفکرین یہی کہتے ہیں۔

اخوان المسلمون کے محمد قطبؒ نے 'جاھلیتہ القرن العشرین' کے نام سے ایک پوری کتاب

لکھی جس کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے۔ امام حسن البنا اور سید قطبؒ مغرب کے خلاف تیغ براں تھے۔ ایران کے علی شریعتی اور امام خمینی مغربی تہذیب کے امام امریکہ کو 'شیطان بزرگ' کہتے تھے۔ ہمارے ہاں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسے خالص جاہلیت قرار دیا اور ان کی کتاب تنقیحات مغربی تہذیب پر ایک زوردار تنقید ہے۔ ہمارے طبقہ علماء میں سے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے ساتھیوں اور تلامذہ نے انگریز کے خلاف باقاعدہ مسلح جدوجہد کی اور دیوبند کا تو خمیر ہی انگریز دشمنی سے اُٹھا ہے، قاری طیب صاحب کی کتاب 'اسلام اور مغربی تہذیب' معروف ہے۔ اقبال نے اپنے اشعار میں مغربی فکر و تہذیب پر جو تنقید کی ہے وہ زبان زد عام ہے۔ اکبرالہ آبادی، علامہ مشرقی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا احمد علی لاہوری، آغا شورش کاشمیری، ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، محمد حسن عسکری، مریم جمیلہ، ڈاکٹر مظہر الدین صدیقی، پروفیسر عبدالحمید صدیقی......غرض ہمارے علماء اور مفکرین کی ایک بڑی تعداد مغربی فکر و تہذیب کو خلاف اسلام اور بے دینی والحاد کا منبع سمجھتی تھی ہم نے طوالت سے بچنے کی خاطر ان بزرگوں کی تحریروں کے اقتباسات دینے سے ہاتھ روکا ہے۔

کیا مغربی تہذیب سے کچھ استفادہ ممکن ہے؟

بعض لوگ ہمارے اس موقف پر اصرار سے کہ ہمیں مغربی فکر و تہذیب کو بہرحال اور بہر قیمت ردّ کر دینا چاہیے، پریشان ہوجاتے ہیں کہ کیا اس طرح کا 'کلی ردّ' ممکن ہے یا اسلام کا تقاضا ہے؟ ہم عموماً 'کلی ردّ' کی اصطلاح استعمال نہیں کرتے اور اس کی بجائے 'اصولی طور پر ردّ کر دیا جائے' جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن وسنت کی نصوص کے ناقابل تغیر ہونے کے باوجود کوئی تہذیب ہوا بند کمرے میں پروان نہیں چڑھتی اور نہ ایک غیر اسلامی تہذیب سو فیصد غیر اسلامی ہوتی ہے کیونکہ ہر تہذیب پہلے سے آنے والے علم وعرفان اور رسوم ورواج کی وارث ہوتی ہے لہٰذا مغربی تہذیب میں بھی ایسے عناصر ہو سکتے ہیں جو وحی کی تعلیمات کے تسلسل اور بچی کچھی اور بگڑی ہوئی صورت ہوں۔ یا اگر یہ تہذیب عقل کی پرستش کرتی ہے تو ضروری نہیں کہ عقل پر مبنی ہر بات اور رویہ خلاف وحی ہو۔ اسی طرح اس تہذیب کے بعض تجربات ایسے ہو سکتے ہیں جو انسانی سطح پر دوسروں کے لیے بھی مفید ہوں۔ ہم ان تمام امکانات کا انکار نہیں کرتے اور نہ ان سے استفادے کو حرام سمجھتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے، جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں عرض کیا ہے کہ ہم مسلمانوں کو اس وقت جس ایقان کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم مغرب

کی موجودہ بالا دست فکر و تہذیب کے مقابلے میں اس سے مختلف اور اس سے متضاد ایک نظام حیات کے علم بردار ہیں۔ ہماری بقاء اور استحکام، ہماری ترقی اور کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ ہم اپنے نظریۂ حیات سے جڑ جائیں کہ یہی ہماری طاقت کا واحد منبع ہے اور یہ کہ مغربی تہذیب داء (بیماری) ہے دوا نہیں۔ اس کی پیروی ہماری ذلت و نکبت کو اور بڑھا دے گی اور ہمیں زوال میں مزید دھنسا دے گی لہٰذا ہمیں کسی قیمت پر اس فکر و تہذیب کی پیروی نہیں کرنی۔ جب اس اصول پر امت مسلمہ اور اس کے سرکردہ طبقات مطمئن ہو جائیں، اس کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل نو شروع کر دیں تو بے شک مغربی فکر و تہذیب سے کچھ محتاط استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کی بعض چیزوں کو لے کر اپنے رنگ میں ڈھال کر استعمال میں لا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر آپ اس وقت جب کہ آپ تعمیر کے ابتدائی مرحلے میں ہیں، آپ اس استثناء سے اپنے نفس کو فریب دے کر اسے مغربی تہذیب کی پیروی کا بہانہ بنانا چاہیں تو ہم اس کی حمایت کیسے کر سکتے ہیں؟ نفس انسانی، متابعت شیطان میں، بہت حیلہ جُو ہے اور وہ بدو کے روایتی اونٹ کی طرح جلد پورے خیمے پر قبضہ کر لیتا ہے۔ لہٰذا اصولی بات یہی ہے کہ پہلے اپنے ذہن و قلب کو اس پر مطمئن کیجیے اور عملاً اسے زندگی کا لائحہ عمل بنائیے کہ ہماری دنیا و آخرت کی کامیابی اسلام سے عملی وابستگی میں ہے، مغربی تہذیب کی پیروی میں نہیں۔ پہلے اپنے قصر زندگی کی بنیادیں اسلام پر اٹھائیے اور جب مضبوط عمارت تعمیر ہو جائے تو رنگ و روغن کے وقت کچھ مسالا مغرب سے بھی لے لیجیے۔ یہ ہمیں گوارا ہوگا لیکن اگر آپ بنیادیں ہی مغربی تہذیب پر اٹھائیں اور اپنے تین سال کے بچے کی تعلیم کی ابتداء ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار سے کریں تو اس کی حمایت کون صاحب عقل کر سکتا ہے؟

حصہ دوم: پاکستان کی مغرب زدہ تعلیم اور اس کی اسلامی تشکیل نو کا مسئلہ

مغربی فکر و تہذیب کے بارے میں ہم نے جو کچھ سطور سابقہ میں کہا ہے ایک اوسط ذہانت کا آدمی بھی اس سے یہ نتیجہ اُخذ کر سکتا ہے کہ آج مسلم معاشرے کی تعلیم اسلامی تعلیمات پر مبنی ہونی چاہیے نہ کہ مغربی فکر و تہذیب پر لیکن مقصود چونکہ بعض لوگوں کی 'غلط فہمی' دور کرنا ہے اس لیے ہم یہ بات مزید دلائل و براہین اور تفصیل سے کہیں گے تا کہ تعلیم کا صحیح اسلامی تناظر ان کے سامنے آ سکے:

تعلیم: دینی منہج کی پہلی ترجیح

ذاتی خوشحالی اور دنیاوی ترقی کے حوالے سے تعلیم کی اہمیت اکثر لوگ سمجھتے ہیں لیکن دین دار عناصر

خصوصاً وہ لوگ جو دعوت وتبلیغ، اصلاح وتزکیہ، اسلامی انقلاب، نفاذِ شریعت، اصلاح معاشرہ وغیرہ کے کاموں میں مصروف ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ دینی کاموں کی ترجیح اول تعلیم وتربیت ہونی چاہیے جیسا کہ قرآن حکیم سے واضح ہے:

۱۔ قرآن حکیم سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو لوگوں کی اصلاح کرنے اور انہیں اسلام قبول کرنے اور اس کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل بنانے کے لیے جو منہج عطا فرمایا وہ، اختصار کے ساتھ، دو ہی چیزوں پر مشتمل تھا، ایک تعلیمِ کتاب وحکمت اور دوسرے تزکیۂ نفس (يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ) چنانچہ

ا۔ حضرت موسیٰ و ہارونؑ کو حکم دیا گیا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اسے نرمی سے حق سمجھاؤ...... تاکہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کر سکے (اور حق اور اس کے تقاضوں کو سمجھ کر ان پر عمل کر سکے) [طٰہ ۲۰: ۴۴ اور النازعات ۷۹: ۱۷۔۱۹]

۲۔ سورۃ الاعلیٰ کا موضوع ہی یہی ہے کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دی جائے اور نفس کا تزکیہ کیا جائے اور یہی بات صحف ابراہیم وموسیٰ میں کہی گئی تھی [الاعلیٰ ۸۷: ۱۴۔۱۹]۔

۳۔ آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی لوگوں کی اصلاح اور ہدایت کے لیے یہی طریقہ تعلیم کیا گیا تھا چنانچہ 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ' کے الفاظ آپ کے دعوتی منہاج کے طور پر قرآن حکیم میں چار دفعہ آئے ہیں [البقرہ ۱۲۹، البقرہ ۱۵۱، آل عمران ۱۶۴، الجمعہ ۲]۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آج بھی اگر کوئی کارِ نبوت کا اتباع کرنا چاہے (اور ختم نبوت کی وجہ سے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ بحیثیت امت اب یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ حق پر عمل کریں اور اسے دوسروں تک پہنچائیں [۱]) تو لوگوں کی اصلاح کرنے اور انہیں قبول حق اور حق کے تقاضوں پر عمل کرنے کی دعوت دینے کا اسلوب وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہمیں سکھایا ہے یعنی تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس۔ تعلیم کتاب تو واضح ہے یعنی قرآن حکیم کی تعلیم مسلمانوں کے نظام تعلیم کا بنیادی نصاب ہونی چاہیے، ہر مرحلے میں اور ہر موقعہ پر۔ تعلیم حکمت سے مراد یہ ہے کہ وہ تمام علوم حِکمیہ وعقلیہ جن کی انسانی معاشرے کو ضرورت پڑتی ہے یعنی معاشیات، سیاسیات، طب، انجینئرنگ، وغیرہ وہ بھی قرآن حکیم کے اصولوں کے مطابق ہونے چاہئیں، ان کے خلاف نہیں ہونے چاہئیں اور تزکیۂ نفس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کی اور قرآن پر مبنی تعلیم اس طرح دی جائے کہ انسانی شخصیت کی اس طرح تربیت

۱۔ آل عمران ۳:۱۱۰

ہوتی جائے کہ اللہ کے احکام کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنا اس کے لیے ممکن اور سہل ہوتا جائے بلکہ یہ اس کی طبیعت اور اس کے لیے مرغوب بن جائے۔

اب ہر کوئی جائزہ لے کر دیکھ سکتا ہے کہ ہمارے علماء، ہمارے دینی ادارے اور دینی جماعتیں جو ورثۃ الانبیاء ہیں کیا 'يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيهِمْ' کے اس قرآنی منہج و معیار کے مطابق تعلیم و تزکیہ کا کام کررہے ہیں؟ کہ ہم اگر کچھ عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

۲۔ آج ہر دوسرا آدمی آپ کو یہ کہتا نظر آتا ہے کہ تعلیم قومی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کون سی تعلیم؟ ظاہر ہے مسلمانوں کے لیے وہی تعلیم ترقی اور کامیابی (دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی) کا ذریعہ بن سکتی ہے جو 'تعلیمِ کتاب وحکمت اور تزکیہ' کے قرآنی اصول پر مشتمل ہو نہ کہ وہ تعلیم جو مغربی تہذیب اور اس کے افکار پر مبنی ہو۔ یاد رہے کہ تعلیم حکمت میں وہ تمام جدید علوم وفنون شامل ہیں جو آج کے مسلم معاشرے کی ضرورت ہیں۔

اگر تعلیم قرآنی اصولوں پر مبنی ہوگی تو بلاشبہ اس تعلیم سے مسلمان دنیا میں بھی ترقی کریں گے اور ان شاء اللہ آخرت میں بھی کامیاب ہوں گے اور اگر تعلیم ایسے اصولوں پر مبنی ہوگی جو خلاف اسلام ہیں، جیسا کہ مغربی تہذیب اور اس کے اصول ہیں، تو پھر مسلمان اس تعلیم سے ترقی نہیں کریں گے بلکہ اس سے مسلم شخصیت مزید فکری انتشار کا شکار ہوگی، مسلم معاشرہ مزید کمزور ہوگا اور ذلت ورسوائی مسلمانوں کا مقدر ٹھہرے گی جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ مسلمان اگر موجودہ زوال سے نکلنا چاہتے ہیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ اسلامی تناظر میں انسان سازی اور مسلمان سازی کے کارخانے لگائے جائیں یعنی تعلیمی اداروں میں مسلمان طلبہ کی ایسی تعلیمی وتربیت کا انتظام کیا جائے کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيهِمْ کے اصول پر عمل درآمد ہوتا نظر آئے۔ اور تعلیم کی بنیاد دوسری قوموں اور تہذیبوں کے غیر اسلامی افکار پر ہرگز نہ رکھی جائے۔ یہ مسلمانوں کی ترقی کی واحد، لازمی اور ناگزیر شرط ہے اور اگر کوئی مسلمان سمجھتا ہے کہ ایسا نہیں ہے تو وہ قرآن کو رد کرتا ہے، اور بے دانشی کی بات کرتا ہے۔

۳۔ اسلام اور مغربی فکر وتہذیب کے حوالے سے بعض مسلمان کئی طرح کی غلط فہمیوں اور مغالطوں کا شکار ہیں مثلاً یہ کہ:

i- مغرب نے تعلیم وتحقیق کے جن اصولوں پر عمل کر کے ترقی کی ہے، قوت حاصل کی ہے اور دنیا پر

غالب آیا ہے ان اصولوں پر عمل کر کے ہم مسلمان کیوں ترقی نہیں کر سکتے؟ کیوں کامیاب نہیں ہو سکتے؟

ii- سائنس وٹیکنالوجی کے بغیر آج کوئی ترقی ممکن ہی نہیں اور سائنس وٹیکنالوجی مغرب کے پاس ہے لہٰذا ہمیں مغرب کی پیروی کرنی پڑے گی۔

iii- آخر ہم مسلمان رہتے ہوئے مغربی تہذیب خصوصاً اس کے نظام تعلیم اور سائنس وٹیکنالوجی سے استفادہ کیوں نہیں کر سکتے؟ گویا ان لوگوں کا موقف یہ ہے کہ اسلام اور مغربی تہذیب (خصوصاً اس کی تعلیم اور سائنس وٹیکنالوجی) میں تلفیق اور تطابق ممکن ہے۔

یہ اور اس طرح کے دیگر بہت سے سوالات اور اشکالات ہیں، جن سے آج کا 'جدید' تعلیم یافتہ نوجوان اور مغرب گزیدہ ذہن دوچار ہے۔ ہم نے اپنی کتاب 'مسلم نشأۃ ثانیہ: اساس اور لائحہ عمل' میں ان سوالات کا تفصیلی جواب دیا ہے۔ یہاں ہم کوشش کریں گے کہ اختصار کے ساتھ کچھ بنیادی باتیں عرض کر سکیں:

ا: قوموں کی قوت، ترقی اور عروج کا انحصار سائنس وٹیکنالوجی پر نہیں ہوتا۔ مسلمانوں نے خلافت راشدہ میں جب ۱۸ سال کے عرصے میں دو سپر پاورز کو شکست دی تھی تو کوئی ایٹم بم نہیں چلایا تھا، نہ وہ سائنس وٹیکنالوجی میں دوسروں سے آگے تھے۔ یہ صرف ایمان و کردار کی قوت تھی۔ یہ مسلمانوں کے اپنے نظریۂ حیات سے محکم وابستگی کا ثمر تھا۔ یہ ان افراد کی طاقت تھی جن کی تعلیم و تزکیہ کا اہتمام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کی نگرانی میں کیا تھا۔ تہذیب کی جان اور اس کی قوت کی رمز 'آدمی' میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ آپ کس قسم کا فرد پیدا کرتے ہیں یہی آپ کا حاصل ہے، یہی آپ کی قوت ہے، یہی فرد آپ کی اجتماعی قوت کی بنیاد ہے۔ اگر آپ یہ نہیں کرتے تو آپ کروڑوں کی تعداد میں بھی ہوں تو آپ بے جان انبوہ ہیں اور بے قوت ریوڑ ہیں جنہیں جدھر چاہے ہانکا جا سکتا ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ میں آپ اس دسترخوان کی طرح ہیں جن پر بھوکے کھانے کو جھپٹتی ہیں۔

ب: اہل مغرب نے اپنی تہذیب کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی ہے وہ ہیں: خدا، رسول، آخرت اور وحی کی نفی۔ ان اصولوں پر ایمان لا کر اور ان کے تقاضوں پر عمل کر کے انہوں نے دنیا میں ترقی کی ہے اور بلاشبہ کی ہے۔ آخرت میں البتہ وہ ناکام ہوں گے کیونکہ وہ ان کے پیش نظر ہی نہیں، اسے وہ مانتے ہی نہیں۔ قرآن کی رو سے اگر کفار سے صالح تر لوگ یعنی سچے مسلمان موجود نہ ہوں تو کفر دنیا میں غالب اور کامیاب ہو سکتا ہے کیونکہ اللہ نے ایک وقت موعود تک اس دنیا کا نظام قائم رکھنا ہے لہٰذا میرٹ اور صلاحیتوں میں برتر مسلمان اگر موجود نہ ہوں گے تو باصلاحیت کفار برسر اقتدار آجائیں گے۔ یہ اللہ کا نظام

ہے۔مسلمان اگر اسلام چھوڑ کر مغربی تہذیب کے افکار پر ایمان لے آئیں۔ان افکار کے تقاضوں پر عمل کریں جیسے اہل مغرب کر رہے ہیں، تو یقینا وہ بھی ان کی طرح دنیا میں ترقی کر سکتے ہیں اور کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن مغرب گزیدہ مسلمانوں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ وہ مسلمان بھی رہنا چاہتے ہیں اور مغرب کی پیروی بھی کرنا چاہتے ہیں۔یہ اصولاً ممکن نہیں اور عقلی و منطقی طور پر بھی محال ہے کیونکہ یہ اجتماع ضدین ہے جو سائنسی لحاظ سے (Scientifically) بھی ناممکن ہے۔اگر دو ایسے عناصر ہوں جن کے اجزاء باہم مل سکتے ہوں تو وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو سکتے ہیں جیسے دودھ میں چینی حل ہو جاتی ہے لیکن اگر ان کے اجزاء باہم متفاوت ہوں، باہم نہ مل سکتے ہوں تو وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر مفید اور مقوی نہیں ہو سکتے جیسے دودھ میں ریت حل نہیں ہو سکتی۔خلاصہ یہ کہ اسلام میں مغربی تہذیب کا پیوند نہیں لگ سکتا۔ دونوں میں تلفیق ممکن نہیں کیونکہ مغربی تہذیب کے افکار اسلامی عقائد سے نہ صرف مختلف ہیں بلکہ ان سے متضاد بھی ہیں لہٰذا اسلامی تعلیم میں اصولاً مغربی تعلیم کا پیوند نہیں لگ سکتا اور دودھ اور ریت کی طرح یہ مفید اور مقوی نہیں ہو سکتا۔

ج: کوئی بھی قوم اور تہذیب ہو اس کے علوم وفنون اس کے تصور و فلسفۂ علم کی پیداوار ہوتے ہیں اور فلسفۂ علم اس تہذیب کے ورلڈ ویو/عقائد کی پیداوار ہوتا ہے اور ان سے مطابقت رکھتا ہے لہٰذا مغرب کے عمرانی علوم ہوں یا سائنسی علوم و ٹیکنالوجی وہ مغرب کے ورلڈ ویو کی پیداوار ہیں۔مغرب کا ورلڈ ویو، جیسا کہ ہم نے سطور سابقہ میں ذکر کیا، خدا، رسول، آخرت اور وحی کے انکار پر مبنی ہے لہٰذا یہ الحادی روح اس کے سارے علوم وفنون اور نصابات میں اسی طرح سرایت کیے ہوئے ہے جیسے جسم انسانی میں خون دوڑتا ہے۔لہٰذا ان علوم وفنون کو ان الحادی اثرات سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ بات کہ علوم وفنون اپنے ماحول، فرد کے عقائد و افکار اور تہذیب کے ورلڈ ویو سے ضرور متاثر ہوتے ہیں، مغربی مفکرین بھی اسے تسلیم کرتے ہیں چنانچہ کارل پوپر [۱] اور تھامس کوہن [۲] اور ہائیڈیگر [۳] جیسا عظیم فلسفی بھی مغربی ٹیکنالوجی کے ملحدانہ اثرات کا اقرار کرتا ہے۔تعلیم تو رہی ایک طرف جس میں کئی سال صرف ہوتے ہیں

---

1) Thomas Kuhn, *The Structure of Scientific Revolution,* 2nd ed. Chicago University Press, 1970), p.170-71.

2) Karl Popper, *"The Logic of Scientific Discovery,"* in The World Treasury of Physics, Astronomy and Mathematics ed. Timothy Ferris (New York: Little Brown & Co. 1991), p 795.

3) Martin Heidegger, *Question Concerning Technology and Other*

Essays, Translated and with an Introduction By William Lovit, (New York: Garland Publishing Co. 1977).

اور نظام تعلیم طالب علم کی شخصیت کو جو رنگ چاہے دے سکتا ہے، آپ ٹی وی، موبائل، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کو دیکھیے جو بظاہر بے جان آلے ہیں اور ان کے ساتھ استعمال کرنے والے کی مصاحبت بہت طویل نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود انہوں نے مسلم طلبا اور نوجوانوں کے ایمان و اخلاق کو بگاڑنے میں جتنا کردار ادا کیا ہے غالباً کسی اور چیز نے نہیں کیا۔ اور مسلمانوں کے خاندانی نظام، ماحول، تعلیمی اداروں میں جو بچا کھچا اسلام ہے اس کے اثرات کو ختم کرنے میں فحاشی، عریانی، زنا، وقت کا ضیاع، پیسے کا غلط استعمال، منشیات، غرض بے راہروی کی کون سی قسم ہے جو اس الیکٹرانک اور سوشل میڈیا نے مسلمانوں میں پیدا نہیں کی۔ پھر بھی آپ کہتے ہو کہ مغربی سائنس و ٹیکنالوجی مسلمانوں کے لیے مفید ہے۔

یہ تھیوری بہت پرانی ہو چکی کہ یہ بے جان آلے ہیں۔ ان کا غلط استعمال ان کو غیر مفید اور ان کا صحیح استعمال ان کو مفید بناتا ہے۔ ان آلات نے دنیا میں کہیں بھی مفید کردار ادا نہیں کیا، خود یورپ اور امریکہ کے دانشور اس گند سے تنگ ہیں۔ اس کے خلاف سیکڑوں تحقیقی رپورٹیں اور ہزاروں کتابیں مغرب میں لکھی جا چکی ہیں۔ ہم نے بھی اپنی بعض تحریروں میں ان کے اعداد و شمار پیش کیے ہیں۔ امریکہ میں مقیم مسلمان سائنسدان ڈاکٹر مشتاق گوہر نے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں جو اردو میں بھی دستیاب ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں برطانوی وزیر اعظم کا بیان آیا تھا (جو ہم نے البرہان میں بھی دیا تھا) جس میں انہوں نے اپنی اس پریشانی کا اظہار کیا تھا کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کو الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے شر سے کیسے بچائیں۔

اس کے برعکس جب مسلمانوں نے اپنے عہد میں سائنسی ترقی کی تھی اور انہوں نے ہزاروں ایجادات کی تھیں لیکن ان کی کوئی ایجاد مخرب اخلاق نہ تھی اور سائنس اور مذہب اور سائنس اور اخلاق میں کبھی کوئی تصادم سامنے نہیں آیا کیونکہ علوم و فنون میں وہ ترقی اسلام کے عقائد/ورلڈ ویو اور تصور علم کے تحت ہوئی تھی لہٰذا وہ سرتاپا مفید تھی اور کسی لحاظ سے بھی نقصان دہ نہ تھی۔ مغرب کی تعلیمی ترقی اخلاق کش ہے، یہ مذہب بیزاری پیدا کرتی ہے، خدا سے دور کرتی ہے، آخرت سے بے نیاز کرتی ہے کیونکہ یہ ایک ایسے ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم کی پیداوار ہے جو الحاد پر مبنی ہے۔

ہم لوگوں کو ان سہولتوں سے منع نہیں کرتے جو مغرب کی سائنس و ٹیکنالوجی نے فراہم کی ہیں لیکن منفرد اصول و اقدار کی حامل اور ایک زندہ قوم کی حیثیت سے اس کا صحیح اسلوب یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے ورلڈ ویو میں اور اپنے تصور علم کے تحت سائنس و ٹیکنالوجی کو خود ترقی دیں اور خود ایجادات کریں نہ کہ دوسری قوموں

کی ایجادات کو استعمال کر کے محض ان کے خریدار اور مستھلک (End User) بنے رہیں اوران کا سامان امپورٹ کر کے ڈالروں سے ان کی جھولی بھرتے رہیں اوراپنا قیمتی زرمبادلہ ان کے حوالے کرتے رہیں۔

۴۔ کیا ہمارا موجودہ نظام تعلیم پوری طرح اسلامی ہے اور عصر حاضر کے مسلم معاشرے کی ضرورتوں اور تقاضوں میں خود کفیل ہے؟ اور کیا وہ ایسا آئیڈیل فرد تیار کر رہا ہے جو قرآن وست کی تعلیمات کی روشنی میں مسلم معاشرے کو مطلوب ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا وہ نسل نو کی 'تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفس' کے ذریعے انہیں اچھا مسلمان بنا رہا ہے اوردنیا کی (انفرادی اوراجتماعی) زندگی اللہ کے احکام کے مطابق بسر کر کے آخرت میں حصول رضائے الٰہی کا نصب العین انہیں دے رہا ہے اور انہیں اس کے قابل بنا رہا ہے؟ ظاہر ہے ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے اوراس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ نظام تعلیم مغرب زدہ ہے بلکہ صحیح تر لفظوں میں اسلام کی بجائے مغربی فکر وتہذیب پر مبنی ہے اور ایسا کسی اتفاق یا حادثے کے نتیجے میں نہیں ہوا بلکہ مغربی استعمار کی پلاننگ اورمنصوبہ بندی سے ہوا ہے۔ اس کی تشکیل ۱۸۳۲ء کی لارڈ میکالے کی اس پالیسی رپورٹ کی روشنی میں ہوئی ہے جس میں اس نے برٹش حکومت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان میں تعلیم اس طرح دی جائے کہ عوام نام کے تو مسلمان (اور ہندو) رہیں لیکن عملی زندگی میں ہماری تہذیب کے شائق اور رسیا ہو جائیں تا کہ ریاست کو قابل اعتماد ملازمین (fathful servants) ملتے رہیں اور برطانیہ کے وزیراعظم نے اس وقت اپنی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے ہاتھ میں قرآن لہراتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک مسلمان معاشرے میں اس قرآن کی تعلیم جاری ہے اس وقت تک انہیں غلام نہیں رکھا جا سکتا۔ چنانچہ مسلم تعلیم کا پورا ڈھانچہ ختم کر دیا گیا اور مغربی فکر وتہذیب کے مطابق اس کی تشکیل نو کی گئی۔ پہلے یہ کام حکومت نے خود شروع کیا پھر آہستہ آہستہ اسے غلام ذہن کے ایسے مسلمان ملنے لگ گئے جو مغربی تہذیب کو اپنانے اور مغربی علوم کی تدریس پر فریفتہ تھے چنانچہ علی گڑھ کالج قائم ہوا اور جدید تعلیم مغربی تعلیم کے اصولوں پر قائم کر دی گئی اور علماء نے (جو پہلے پوری تعلیم دے رہے تھے جو فرد سے لے کر معاشرے اور ریاست سب کو موزوں افراد کا رمہیا کرتی تھی) مجبور ہو کر مٹی کے حجروں میں بیٹھ کر بلا تنخواہ و معاوضہ قرآن وسنت کی تھوڑی بہت تعلیم دینی شروع کی تا کہ معاشرہ بالکل ہی اسلام سے کٹ کر نہ رہ جائے۔ وقتی طور پر تو یہ پالیسی درست تھی لیکن قیام پاکستان کے بعد تعلیم کی یہ غیر اسلامی ثنویت ختم ہو جانی چاہیے تھی اور یہ بہترین موقعہ تھا کہ جس طرح انگریز نے مسلم ہندوستان کے اجتماعی ڈھانچے کو گرا کر اسے مغربی فکر وتہذیب کے مطابق تعمیر کیا تھا، اب اسے گرا کر اسلامی اصولوں پر اس کی تشکیل نو کی جاتی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

اس کے داخلی اسباب بھی تھے لیکن اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ انگریز نے منصوبہ بندی سے اقتدار

ایسے لوگوں کے سپرد کیا جو معاشرے کی اسلامی تشکیل نو کی آرزو رکھتے تھے اور نہ اس کی اہلیت وصلاحیت بلکہ مغربی فکر و تہذیب کی چکا چوند سے جن کی نگاہیں خیرہ تھیں اور وہ مغربی تہذیب کی پیروی میں ہی اپنی اور قوم کی نجات سمجھتے تھے چنانچہ اجتماعی ڈھانچے (سیاسی نظام، معاشی نظام، معاشرتی نظام، قانونی و عدالتی نظام......) اور خصوصاً تعلیم کی اسلامی تشکیل نو کے لیے کچھ نہ کیا گیا۔ جدید تعلیم پہلے کی طرح مغرب زدہ رہی اور دینی مدرسے اسلام کی جزوی تعلیم دے کر اسے مکمل اسلامی تعلیم سمجھتے رہے۔ حکومتوں نے عوامی مطالبے پر کچھ درخ اندوزی (Patch work) کر کے دینیات/اسلامیات کے نام سے ایک اسلامی مضمون کا اجرا کر دیا جو مختصر، ناقص اور غیر موثر تھا اور تعلیمِ حکمت یعنی عمرانی وطبیعی علوم کی تعلیم مغربی اصولوں پر جاری رہی اور نسل نو کی اسلامی تربیت اور ان کے تزکیہ نفوس کے لیے بھی کوئی کام نہ ہوا۔ نتیجتاً دو ٹانگوں کے جانور پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اس معاشرے کو مہذب انسانوں کی رہائش کے قابل نہیں رہنے دیا۔

ہماری تعلیم کے ساتھ ایک سانحہ یہ بھی ہوا کہ وہ دینی عناصر جو حکومتوں سے 'اسلامی نظام تعلیم نافذ کرو' کا مطالبہ کیا کرتے تھے جب تعلیم کی پرائیویٹائزیشن کے نتیجے میں انہیں خود تعلیمی ادارے قائم کرنے کا موقعہ ملا تو اس وقت تک مغربی جمہوریت قبول کرنے اور اہل مغرب کی اپنی تہذیب کی یونیورسلائزیشن اور گلوبلائیزیشن کی پالیسی کے نتیجے میں پاکستانی معاشرے میں مغربی افکار و تہذیب پر مبنی تعلیم سکہ رائج الوقت بن چکی تھی چنانچہ وہ بھی مادیت اور کمرشلزم کے اس سیلاب میں بہ گئے اور جیسی تعلیم معاشرے میں دی جا رہی تھی وہ بھی ویسی ہی تعلیم دینے لگے (یا اس میں چند ظاہری چیزیں شامل کر کے اس پر اسلامی کا لیبل لگا کر اسے بیچنے لگے) اور کرنے کے جو حقیقی کام تھے، وہ کسی نے نہ کیے۔ وہ دو کام کیا تھے جن کے بغیر ہماری تعلیم کو 'اسلامی تعلیم' نہیں کہا جا سکتا؟ **ایک** تو یہ کہ نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں لائی جاتیں یعنی

۱۔ وحدت تعلیم کے تصور کو عملی شکل دی جاتی کیونکہ اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی اور نہ دینی اور دنیاوی تعلیم کے الگ الگ ہونے کا کوئی تصور پایا جاتا ہے۔ بارہ صدیوں تک مسلمانوں کا 'نظام تعلیم وحدت پر مبنی تھا اور علماء کرام کے ہاتھ میں تھا۔ یہ مغربی استعمار کی سازش اور اس کا ردِّعمل ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی و دنیاوی تعلیم الگ الگ ہوگئی جس نے مسلم معاشرے میں سیکولرزم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

۲۔ دین کی بنیادی تعلیم، جو ہر مسلمان پر فرض ہے، وہ موثر انداز میں دی جاتی اور دین کی تخصصی تعلیم کا انتظام اس طرح کیا جاتا کہ رسوخ فی العلم کے ساتھ جدید اور عصری علوم سے گہری واقفیت بھی طلبہ کو حاصل ہو جاتی تا کہ جدیدیت اور مغربیت کے فتنے سے وہ خود بچ سکتے اور اپنی قوم کو بچا سکتے اور مغرب

کے علمی چیلنج کا جواب دے سکنے کی پوزیشن میں آ جاتے۔

۳۔ عمرانی علوم کی ازسرنو تشکیل کی جاتی اور ان کی اسلامی تناظر میں اس طرح تدوین نو کی جاتی کہ پچھلی صدیوں میں جو تمدنی ترقی ہوئی ہے اور انسانی علوم میں پیش رفت ہوئی ہے اس کے جو عناصر اسلامی لحاظ سے قابل قبول ہیں انہیں اپنے مزاج میں ڈھال کر تعلیم کا حصہ بنالیا جاتا اور باقی کو رد کر دیا جاتا۔

۴۔ طبیعی علوم کی تدریس اس طرح کی جاتی کہ مسلم معاشروں میں ایسے سائنسدان پیدا ہونے شروع ہو جاتے جو اکتشافات جدیدہ اور تسخیر کائنات کے لیے اسلامی تناظر میں کام کرتے۔

۵۔ تعلیم کتاب وحکمت کا مندرجہ بالا کام اس طرح کیا جاتا کہ طلبہ کے نفوس کا تزکیۂ اور اسلامی تربیت بھی ساتھ ہوتی جاتی۔ تقویٰ کا حصول سب کا ماٹو ہوتا اور تعمیرِ شخصیت وکردار سازی سب کا ہدف ہوتی۔

ان کاموں کے موثر طور پر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نصابات ازسرنو تشکیل دیے جائیں، اساتذہ کی تربیت نئے منہج سے کی جائے، ہم نصابی سرگرمیاں اسلامی تناظر میں تشکیل دی جائیں، طلبہ کی ذہن سازی اور تربیت کی جائے اور تعلیمی انتظامیہ کی بھی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ ان مقاصد کو حرزِ جاں بنا کر کام کرے۔ اور یہ سارے کام اس طرح کیے جائیں کہ شعوری طور پر مغرب کی نقالی اور مغربی فکر وتہذیب کی پیروی سے بچا جائے اور اسلامی تناظر اور تقاضوں کو سامنے رکھا جائے۔

دوم: لیکن یہ سارے کام تعلیم کے موجودہ اداراتی ڈھانچے میں رہ کر کماحقہ انجام نہیں دیے جا سکتے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک نیا رول ماڈل سکول اور یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں یہ سارے تجربے کیے جائیں۔ پھر دوسرے سکول اور یونیورسٹیاں اسے دیکھ کر اس جیسا بننے کی کوشش کریں۔ بہتر ہے یہ کام حکومت کرے لیکن اگر حکومت نہیں کرتی تو پرائیویٹ سیکٹر یہ کام کر سکتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں ہزاروں کی تعداد میں سکول اور بیسیوں یونیورسٹیاں پرائیویٹ سیکٹر میں کام کر رہی ہیں اور ان میں کئی ہزار سکول اور کئی یونیورسٹیاں ان لوگوں کی بھی ہیں جو اسلام کے سلوگن کے ساتھ کام کر رہے ہیں لیکن وہ مندرجہ بالا کاموں میں سے کوئی بھی کام نہیں کر رہے بلکہ یہ سکول، یونیورسٹیاں اور کالج مغرب زدہ تعلیم اسی طرح دے رہے ہیں جس طرح ہمیں انگریز سے ورثے میں ملی تھی اور جس طرح دوسرے ادارے دے رہے ہیں۔ دوسرے ادارے اگر آکسفورڈ کی نصابی کتب پڑھاتے ہیں تو یہ اسلامی ادارے بھی پڑھاتے ہیں۔ وہ اگر برطانوی نصاب کے مطابق او اور اے لیول کے امتحان دلواتے ہیں تو یہ بھی دلواتے ہیں۔ ان کے ہاں مخلوط تعلیم ہے تو اسلام کے علمبردار اداروں کے ہاں بھی ہے۔ اُن کے ہاں

تربیت اساتذہ اور تربیت طلبہ اسلامی تناظر میں موجود نہیں تو اس ضمن میں اسلامی کہلانے والے تعلیمی ادارے بھی کچھ نہیں کرتے۔ ہم نصابی سرگرمیاں عام سکولوں میں مغرب زدہ ہیں تو اسلامی اداروں میں بھی ہیں۔ وہ اگر طلبہ کو مغربی لباس پہننے پر مجبور کرتے ہیں تو اسلامی تعلیمی ادارے بھی یہی کچھ کرتے ہیں......وغیر ذلک۔

ان حالات میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اسلام کا نام لے کر کام کرنے والے تعلیمی ادارے بالعموم اپنا کام کما حقہ نہیں کر رہے البتہ جو لوگ اخلاص نیت سے اس ضمن میں تھوڑا بہت کام کر رہے ہیں وہ مستحق تبریک اور مستحق حوصلہ افزائی ہیں۔ ہم جب کسی سے کہتے ہیں کہ یہ کام تم اتنے بھدے طریقے سے کر رہے ہو کہ اس سے نہ کرو تو بہتر ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ شخص کام ہی نہ کرے اور اسے چھوڑ دے بلکہ یہ تنقید اس کی اصلاح کے لیے ہوتی ہے، اسے مزید اونچا اڑانے کے لیے ہوتی ہے، اس کی حمیت و جرات و صلاحیت بیدار کرنے کے لیے ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح کر لے اور اپنے کام کو اچھے اور مطلوبہ معیار کے مطابق کرے۔ اسی لیے جب ہم کہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اسلامی کہلانے والے تعلیمی ادارے کما حقہ اچھا کام نہیں کر رہے تو اس کا مطلب ان پر منفی تنقید اور ان کی حوصلہ شکنی نہیں ہے کہ وہ یہ کام ہی چھوڑ دیں بلکہ اس سے مقصود ان کو تنبیہ کرنا اور توجہ دلانا ہے کہ وہ اس کام کو اس کے صحیح تقاضوں کے مطابق کریں تاکہ گوہر مقصود حاصل ہو نہ کہ صرف نعرے مارے جائیں اور ڈلیور کچھ بھی نہ کیا جائے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ کئی عملی مجبوریاں اور مشکلات بھی ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ان مجبوریوں اور مشکلات سے نمٹنے کے لیے دو طرح کے رویے ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا مقابلہ اور ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کی جائے اور دوسرے یہ کہ حالات سے سمجھوتہ اور Compromise کر کے سپر ڈال دی جائے۔ بدقسمتی سے اسلامی تعلیمی اداروں کا رویہ پہلا نہیں دوسرا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل ایشوز کو لیجیے اور ان پر غور کیجیے:

۱۔ فیس لینا ۲۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم (انگلش میڈیم)

۳۔قبل سکول تعلیم (ارلی چائلڈ ہڈ ایجوکیشن) ۴۔ او اور اے لیول کے امتحانات۔

۱۔فیس لینا

آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب حکومت خود تعلیم نہیں دیتی اور نہ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو گرانٹ دیتی ہے تو پرائیویٹ ادارے مجبور ہیں کہ وہ فیس لیں۔ ٹھیک۔ اب دوسری سمت دیکھیے۔ ہماری آنکھوں کے

سامنے معاشرے میں دینی مدارس موجود ہیں جو فیس نہیں لیتے لیکن چل رہے ہیں کیونکہ عوام ان کے کام کو 'دینی کام' سمجھ کر انہیں زکوٰۃ وصدقات وعطیات دیتے ہیں اور وہ کامیابی سے اپنا کام رہے ہیں۔ اگر اس ملک کی دینی جماعتیں اور ادارے تحریک چلائیں اور عوام کے پاس جائیں اور انہیں سمجھائیں کہ جدید تعلیم اسلامی تناظر میں دینا بھی ایک اسلامی کام ہے، کارِثواب ہے تو وہ ان کو بھی زکوٰۃ وصدقات وعطیات دینا شروع کر دیں گے لیکن عوام کی تربیت کی ایسی کوئی کوشش آج تک نہیں کی گئی۔ ضرورت سمجھ کر فیس لینی شروع کی گئی اور پھر سیکولر اداروں کی طرح اسلامی لوگ بھی اس انڈسٹری میں سرمایہ کاری کرنے لگے۔ کئی لوگ ہمارے علم میں ہیں جو بنکوں سے سودی سرمایہ لے کر یہ کام کر رہے ہیں اور ہر قیمت پر اور زیادہ سے زیادہ منافع سیکولر لوگوں کی طرح ان کا بھی ماٹو بن گیا ہے۔

۲۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم

انگریزی ذریعہ تعلیم یقیناً تعلیمی لحاظ سے نقصان دہ ہے جس کے بے شمار دلائل موجود ہیں۔ قانونی لحاظ سے یہ خلاف آئین ہے کہ اس سے اردو کی بحیثیت قومی زبان حق تلفی ہوتی ہے۔ اسلامی اور تہذیبی لحاظ سے یہ ناقابل قبول ہے کیونکہ یہ مغرب کی فکری غلامی پر منتج ہوتا ہے لیکن مغربی قوتوں اور ان کے تعلیمی وعلمی اداروں نے مقامی گماشتہ حکمرانوں اور مغرب زدہ بیوروکریسی کے ذریعے اسے پاکستان پر مسلط کر دیا۔ تعلیم میں سیکولر لوگوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی لوگوں اور اسلامی تعلیم کے علم برداروں نے اسے کیوں قبول کیا؟ کیوں عوام کو نہیں بتایا کہ انگلش میڈیم ہر لحاظ سے غلط اور نقصان دہ ہے، کیوں اعلیٰ عدالتوں میں نہیں گئے کہ یہ غیر قانونی اور غیر آئینی ہے؟ کیوں اردو کے حق میں تحریک نہیں چلائی؟ کیوں ایسے اردو میڈیم سکول چلا کر نہیں دکھائے جن میں بہترین انگریزی پڑھائی جاتی ہو اور جن کے بچے انگلش میڈیم سکولوں سے بچوں کا مقابلہ کر سکتے ہوں، جب کہ ایسا کل بھی ہوسکتا تھا اور آج بھی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اسلامی سکولوں نے اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے اور اس کی اصلاح کرنے کی بجائے یہ کہہ کر سپر ڈال دی اور اسے قبول کر لیا کہ کیا کریں مجبوری ہے! عوام اردو میڈیم کو اہمیت ہی نہیں دیتے، اپنے بچے اردو میڈیم سکول میں داخل ہی نہیں کراتے! ہم سکول کیسے چلائیں؟ سوال یہ ہے کہ جب آپ نے انگلش میڈیم کو قبول کر لیا تو اب اس غلط صورت حال کی اصلاح کون کرے گا؟ اور کیسے کرے گا؟

۳۔ قبل سکول تعلیم (ارلی چائلڈ ہُڈ ایجوکیشن)

مسلم تعلیمی روایت میں اور مسلمانوں کی معاشرتی وتہذیبی زندگی میں پچھلی چودہ صدیوں میں قبل

سکول تعلیم کی کوئی ایک مثال نہیں ملتی کیونکہ اسلامی نظام معاشرت میں ماں گھر میں ہوتی ہے، باپ کے علاوہ، دادا دادی بھی گھر میں ہوتے ہیں اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ یہ ماں کا مقدس فریضہ ہے کہ وہ مسلمان بچے کی تعلیم و تربیت اُس وقت تک گھر میں اسلامی اصولوں کے مطابق کرے جب تک وہ باقاعدہ مدرسہ جانا شروع نہیں کرتا۔

اچھا اب مغرب کا حال دیکھیے کہ مغربی تہذیب کی عورت اول تو شادی نہیں کرنا چاہتی اور بغیر شادی کیے اور بچے پیدا کیے شادی کے مزے حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن اگر نکاح کے بغیر بچہ پیدا ہو جائے تو یہ اس کے لیے ایک مصیبت ہوتی ہے کیونکہ وہ نوکری کرتی ہے اور اسے دفتر جانا ہوتا ہے...... کیونکہ وہاں کے نظام سرمایہ داری نے ایسے مالی حالات پیدا کر دیے ہیں کہ جب تک وہ بھی نوکری نہ کرے گھر نہیں چل سکتا۔ اب کیونکہ اسے نوکری کرنی ہے (اور گھر میں دادا، دادی بھی نہیں کیونکہ وہ تو اولڈ ہومز میں ہوتے ہیں) لہٰذا وہ مجبور ہے کہ وہ چند دن یا چند ہفتے کے اس بچے کو ڈے کیئر سنٹر میں چھوڑ کر جائے اور جب وہ کچھ بڑا ہو جائے تو اسے پری سکول (قبل تعلیم سکول) میں داخل کرا دے جہاں دو تین سال کی عمر میں پہلے وہ پلے گروپ میں کھیلے کودے، پھر نرسری میں جائے (جہاں خادمائیں اس کے پیشاب پاخانہ اور صفائی ستھرائی کا خیال رکھتی ہیں) پھر انہیں پریپ میں بھیجے اور اس ماحول میں بچہ اس وقت تک رہے جب تک وہ پہلے گریڈ میں داخلہ لینے کا اہل نہیں ہو جاتا۔ سوال یہ ہے کہ پاکستانی معاشرت میں جہاں ۹۹ فیصد مائیں گھر میں ہوتی ہیں۔ اس پری سکول تعلیم کی ضرورت کیا ہے؟ اور کیا جواب ہے ان مسلمان تعلیمی اداروں کے مالکان کے پاس، خصوصاً وہ جو اسلامی تناظر میں کام کرتے ہیں، کہ انہوں نے پری سکول کیوں کھولے ہوئے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ مغرب اپنی تہذیب مسلمان معاشرے کو برآمد کرنا چاہتا ہے چنانچہ ہمارے علم میں ہے کہ یو ایس ایڈ نے ہماری پبلک سیکٹر یونیورسٹیوں کو کہا کہ جو کالج ارلی چائلڈ ہڈ ٹیچر ایجوکیشن کا شعبہ کھولے گا اس کا سارا خرچہ وہ برداشت کرے گا۔ ساتھ ہی اتھارٹیز کی طرف سے ترغیبی خط بھی تھا کہ یہ شعبہ شروع کر دیا جائے۔ اسی طرح مغربی اداروں نے پرائیویٹ سیکٹر کے سکولوں میں اپنے گماشتوں کے ذریعے (یعنی ان NGOs کے ذریعے جنہیں وہ فنڈنگز کرتے ہیں) پری سکول شروع کرا دیے اور اس طرح یہ آہستہ آہستہ پاپولر ہو گئے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ مغرب میں اس طرح کے پری سکول سائنسی بنیادوں پر کام کرتے ہیں۔ وہاں بچوں کے لیے کھیل کود اور کھیل کے ذریعے تعلیم کی وافر سہولتیں موجود ہوتی ہیں۔ ہمارے لوگوں نے اس اصول کے مطابق کہ نقل کے لیے عقل کی کیا ضرورت ہے، ان معصوموں کے لیے کتابیں لکھنی شروع کر دیں اور اب حال یہ ہے کہ پلے گروپ، نرسری اور پریپ کے سب مراحل کے لیے ان معصوموں کے اچھے خاصے بھاری بستے ہوتے ہیں جو وہ اٹھا بھی

نہیں سکتے۔ ہمارے علم کی حد تک کوئی اسلامی سکول ایسا نہیں جس کے ہاں پری سکول کی کلاسیں نہ ہوں۔ اب بتایئے ہم اس کا ماتم کہاں کریں اور کس کے سامنے کریں کہ ایک مسلم معاشرے میں اور ایک مسلم نظام تعلیم میں یہ کیا ہورہا ہے؟ بجائے اس کے کہ ہمارے اسلامی لوگ، اسلامی جماعتیں، اسلامی ادارے اور اسلامی سکول اس رویے کے خلاف اُٹھتے، اس کی مزاحمت کرتے اور والدین کی تربیت کرتے، انہوں نے خاموشی سے اس کو قبول کرلیا کیونکہ اس عمر کے بچوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور سکول کو مالی اور عددی لحاظ سے' کامیاب' بنانے میں مدد دیتی ہے۔ اب ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

۴۔او اور اے لیول کے امتحانات

مغربی قوتوں نے پاکستانی اور مسلم نظام تعلیم کے ہر شعبے پر وار کرنے اور اسے تباہ کرنے کے لیے الگ اور مخصوص حکومت عملی اپنائی اور اس میں کامیاب رہے۔ شعبہ امتحانات کو ناکام بنانے کے لیے یہ منصوبہ بندی کی گئی کہ سکولوں کے نظام امتحانات کو ناکارہ اور ناقابل اعتماد ثابت کیا گیا۔ پرچے آؤٹ کرائے گئے، نقل مافیا حرکت میں آیا، رزلٹ لیٹ کیے گئے، رزلٹ میں غلطیاں اور بدانتظامیاں کی گئیں، کمپیوٹر کے سافٹ وئیر پروگرام گڑبڑ ہوگئے اور بتدریج ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈوں کی کارکردگی مایوس کن ٹھہری۔ اس کے علاج کے لیے ایک طرف آغا خان بورڈ کو لائسنس دیا گیا اور دوسری طرف برطانوی نظام کے تحت او اور اے لیول کے امتحانات متعارف کرائے گئے۔ کبھی کسی نے سوچا ہے کہ ان غیر ملکی امتحانات کی قانونی پوزیشن کیا ہے؟ ہمارا کتنا قیمتی زرمبادلہ ان کے ذریعے باہر جاتا ہے؟ کتنے ہزار مسلمان بچوں کو ایک غیر مسلم سسٹم کا تیار کردہ نصاب پڑھنا پڑھتا ہے؟ غیر پاکستانی اور غیر مسلموں کا تیار کردہ یہ نصاب کس طرح مسلمان بچوں کے ذہن کو مغربیت پر استوار کرتا ہے اور اسلام اور پاکستان کی دینی اور تہذیبی قدروں سے دور کرتا ہے؟

کیا اسلامی افراد، اسلامی جماعتوں، اسلامی اداروں اور اسلامی سکولوں نے مندرجہ بالا سوالوں پر کبھی غور کرنے کی زحمت کی ہے؟ کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اس سازش کے خلاف آواز اٹھائی ہے، اس کے خلاف مزاحمت کی ہے اور اس کے خلاف تحریک اٹھانے کی کوشش کی ہے؟ اسلامی سکولوں نے اسے بخوشی قبول کرلیا، اپنا لیا اور ان میں سے اکثر او اور اے لیول کرا رہے ہیں۔

ہم نے تعلیم کے یہ تین چار موضوع بطور نمونہ قارئین کے سامنے رکھے ہیں۔ باقی سارے تعلیمی مسائل کا بھی یہی حال ہے کہ ہمارے اسلامی لوگوں نے حالات کا مقابلہ کرنے اور ان کی اصلاح کرنے

کی بجائے خاموشی سے انہیں قبول کر لیا اور مغربیت کے اس سیلاب میں بہ گئے جس میں معاشرہ کے دوسرے سیکولر اور بے حس لوگ بہ رہے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دینی لوگوں نے اسلامی تعلیم وتربیت کو اپنی ترجیح اول بنایا ہی نہیں، اسے وہ اہمیت دی ہی نہیں جو قرآن اسے دیتا ہے۔ کچھ لوگ ایک خاص طرح سے تبلیغ کر کے خوش ہیں کہ ہم نے دین کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔ کچھ لوگ سیاسی جدوجہد کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم دین کا بول بالا کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ دینی مدارس قائم کر کے مطمئن ہیں کہ ہم نے دین لوگوں تک پہنچا دیا۔ حالانکہ ان میں سے کسی نے 'یعلمهم الکتاب والحکمة ویزکیهم' کا حق کما حقہ ادا کیا ہی نہیں ☆۔

ہماری اپنی وضاحتوں میں یہ مضمون اتنا طویل ہو گیا ہے کہ ہم ان کئی نکات کو زیر بحث نہیں لا سکے جو وقاص صاحب نے اپنے مضمون میں اٹھائے تھے لہٰذا ایک دو باتوں کی طرف اشارہ کر کے ہم اس مضمون کو سمیٹیں گے۔

مخلوط تعلیم

وقاص صاحب کہتے ہیں کہ مخلوط تعلیم پر تو معاشرے کا اتفاق ہے، باقی باتوں پر نہیں۔ میرے بھائی! معاشرہ معیار نہیں معاشرہ تو خود اصلاح طلب ہے، معیار قرآن ہے، معیارِ سنت رسول ہے اور آپ تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ آپ کا رویہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ وہ کام کریں جو معاشرہ چاہتا ہے بلکہ آپ کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ آپ معاشرے کی پسند و ناپسند کو بدلیں اور اسے خدا اور رسول کی پسند و ناپسند کے مطابق ڈھالیں۔ نظامِ تعلیم میں ہمہ جہت تبدیلی مطلوب ہے، مخلوط تعلیم تو صرف ایک برائی ہے، باقی سب برائیوں اور خامیوں و کمزوریوں کو بھی دور کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں اچھے نتائج تب نکلیں گے جب تعلیم کے سارے اجزاء کی اصلاح اور اسلامی تناظر میں تشکیل نو کی جائے گی یعنی نصاب، اساتذہ، سکول انتظامیہ، طلبہ، ہم نصابی سرگرمیاں وغیرہ لیکن اگر آپ تربیت اساتذہ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں تو اس میں بھی کوئی برائی نہیں۔ آپ ملک کے لاکھوں اساتذہ کی اسلامی تربیت کا انتظام کر دیں تا کہ ان کی نہ صرف پروفیشنل گروتھ ہو بلکہ انہیں یہ بھی پتہ چل جائے کہ بچوں کی اسلامی تربیت کر کے انہیں مستقبل میں اچھا مسلمان کیسے بنانا ہے تو یہ ایک عظیم خدمت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق دے۔

سکول یونیفارم

ہمارے تعلیمی ادارے اس وقت جو مغرب زدہ تعلیم دے رہے ہیں، اور جیسا کہ ہم نے واضح کیا

کہ یہ مغرب زدگی ہی اسلامی آدرشوں کی شکست کا بنیادی سبب ہے، اس کا ایک نامطلوب مظہر یہ بھی ہے کہ وہ پاکستانی مسلمان بچوں بچیوں کو مغربی لباس (یونیفارم) پہننے پر مجبور کرتے ہیں۔ لڑکے تو رہے ایک طرف

☆ دینی لوگوں، خصوصاً تحریک اقامت دین نے، تعلیم کو بنیادی اہمیت کیوں نہیں دی؟ اس کا جواب ہمارے پاس موجود ہے لیکن فی الوقت ہم کسی سائڈ ایشو میں الجھنا نہیں چاہیے۔

ہم نے لڑکیوں کو بھی نکٹائی پہنتے دیکھا ہے اور سخت سردی میں نیکر پہنے دیکھا ہے کہ سکول یونیفارم کی مجبوری ہے۔ ہم اسے بھی مغرب کی ذہنی غلامی کا ایک جزو سمجھتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ امریکہ و یورپ کے مسلمان ظاہر ہے پینٹ کوٹ ہی پہنیں گے نہ کہ شلوار قمیض اور اسلام کسی خاص لباس یا تمدن کا نام نہیں ہے لیکن جہاں تشبہ با لکفار اور کفار سے ذہنی مرعوبیت کا معاملہ ہو تو کفار کا لباس نہیں پہننا چاہیے۔ ہم لوگ چونکہ دوسو سال انگریز کے غلام رہے ہیں اور انگریزی لباس پہننا ار داڑھی منڈانا انگریزی کلچر کا حصہ تھا اور یہ ہندو پاک میں بلوہ عام کی صورت اختیار کر گیا ہے اور ان سے مانوسیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کی اپراہٹ محسوس نہیں ہوتی تاہم سکولوں کو اپنے طلبہ کو مجبور نہیں کرنا چاہیے کہ وہ پاکستانی لباس نہ پہنیں اور لازماً مغربی لباس ہی پہنیں جن میں بعض اوقات منصوص شرعی قباحتیں بھی ہوتی ہیں مثلاً نکٹائی عیسائیوں کا مذہبی شعار ہے اور بچیوں کو سکارف اور دوپٹے کی بجائے وی کی پٹی کی تربیت دینا خلاف شریعت ہے۔ تاہم لباس کی بات کوئی بنیادی بات نہیں یہ محض ایک سمبل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ نظام تعلیم کی اسلامی تناظر میں تشکیل نو کی جائے اور ملحدانہ مغربی فکر و تہذیب کے برے اثرات سے بچا جائے۔ اور اس کام کو انبیاء کرام کی طرح اپنا اصل کام اور بنیادی ترجیح بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق دے۔

یہ کوئی مناظرہ نہیں ہے جسے ایک فریق کی فتح اور دوسرے کی شکست پر منتج ہونا ہے اور ہر فریق کو لازماً اپنے موقف کا دفاع کرنا ہے بلکہ یہ دو بھائیوں کے درمیان ایک موضوع پر مل کر غور کرنے کی ایک کوشش ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم میں سے کوئی ابھی اور اسی وقت دوسرے کے موقف کی صحت کو تسلیم کر لے۔ ہم ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہیں گے اور اخلاص نیت سے حق پر پہنچنے کی جستجو جاری رکھیں گے، ان شاء اللہ۔ تاہم اگر بھائی وقاص صاحب یا کوئی اور صاحب ہمارے اس مضمون کا جواب دینا چاہیں یا اس پر تبصرہ کرنا چاہیں تو البرہان کے صفحات حاضر ہیں۔

اللہ کرے ہم جناب محمد وقاص خاں صاحب اور ان کے ہم خیال احباب کے سامنے اپنا نقطۂ نظر موثر طور پر پیش کر سکے ہوں تاکہ وہ ہماری معروضات پر سنجیدگی سے غور فرمائیں اور صحیح سمت میں عمل کے

کچھ راستے نکلیں۔

آخر میں ہم جناب محمد وقاص خاں صاحب سے ایک درخواست کرتے ہیں کہ اگر ہماری باتیں ان کو اجنبی اور اوپری لگتی ہیں تو وہ انہیں چھوڑ دیں اور جماعت کے بانی امیر اور عالم اسلام کے مایہ ناز مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتاب 'تعلیمات' کو سامنے رکھ لیں اور جماعتی احباب کے سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دینی مدرسوں کی اصلاح اس کے مطابق کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں تو یہ کافی ہے۔ ہم اس سے زیادہ کا ان سے مطالبہ نہیں کرتے۔ و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین۔

تعلیم و تربیت چوہدری رفاقت علی☆

علم الاسماء

انسان سے پہلے دو قسم کی مخلوق تھی: ایک فرشتے، دوسرے جنّ۔ یہ دونوں قسمیں، علوی اور سفلی، ارضی اور سماوی اشیاء (دونوں سے) متمتع اور منتفع نہیں ہوسکتیں۔ فرشتوں کا منتفع نہ ہونا تو بالکل ظاہر ہے کہ فرشتوں کو نہ زن اور فرزند کی ضرورت اور نہ طعام وشراب کے لوازم یعنی شہوت اور غضب کی ان کو حاجت۔

جنات اگرچہ بعض چیزوں سے متمتع اور منتفع ہوتے ہیں مگر لطافت بدنی اور غلبۂ ناریت کی وجہ سے بہت سے سامانِ حفاظت سے مستغنی ہیں۔ نہ ان کو کسی مکان اور عمارت کی ضرورت اور نہ کسی قلعہ اور بُرج کی حاجت اور نہ وہ اپنی حفاظت میں تیر و تلوار...... اور کسی قسم کے ہتھیار کے محتاج ہیں۔ اگر وہ عالم کی بعض اشیاء سے نفع حاصل بھی کرتے ہیں...... تو وہ بھی ناتمام اور ناقص ہے۔

اس کے علاوہ جنات کی قوتِ خیالیہ ان کی قوتِ عقلیہ پر اس درجہ غالب ہے کہ جس چیز کا وہ خیال کر لیتے ہیں اسے واقعی سمجھنے لگتے ہیں اس لیے ان کا نفع حاصل کرنا حقیقی اور واقعی نہیں بلکہ خیالی ہوتا ہے۔

اس کے برعکس انسان ان تمام چیزوں سے فی الحقیقت اور علی وجہ الکمال نفع حاصل کرتا ہے۔ جسمانی حیثیت سے تمام عناصرِ اربعہ اور عالمی سفلی کی تمام اشیاء سے نفع حاصل کرسکتا ہے اور روحانی حیثیت سے عالم علوی کی تمام چیزوں سے صفات ربانیہ سے متصف ہو کر پورے کا پورا نفع حاصل کرسکتا ہے۔

اس تمہید کے بعد آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو کون کون سے علوم عطا فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو طرح کا علم عطا فرمایا ہے:

۱۔ علم الاسماء ۲۔ علم وحی

سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ علم الاسماء ہے کیا؟ یہ وہ خاص علم ہے جو انسان کو تخلیق کے ساتھ ہی عطا فرما دیا گیا تا کہ وہ اس علم کو کام میں لاتے ہوئے دنیا میں زندگی بسر کر سکے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سے نام تھے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو سکھائے تا کہ وہ دنیا میں اس کے کام آ سکیں......اس میں مفسرین کرام کی مختلف آراء ہیں......بعض ان ناموں سے مراد کائنات میں پائی جانے والی چیزوں کے نام،ان کی خاصیتیں اور انسان کو پیش آنے والی

☆ ماہر تعلیم،لاہور، 0333-4575158

کیفیات کا علم ہے......مثلاً بھوک، پیاس،صحت اور بیماری وغیرہ۔

''علم الاسماء'' اللہ تعالیٰ نے ایک اہم فریضہ (خلافتِ ارضی) سونپنے سے پہلے حضرت آدمؑ کو ودیعت کیا۔ یہ علم اللہ رب العزت نے حضرت آدمؑ کو جنت میں ہی عطا کیا بلکہ القاء فرمایا......تا کہ حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت خلافت ارضی کی ذمہ داریوں کو احسن طریق سے انجام دے سکے۔

''خلافتِ ارضی'' اور ''علم الاسماء'' کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔''علم الاسماء'' کی عدم موجودگی میں ''خلافت ارضی'' کا فریضہ انجام دینا ممکن نہیں تھا۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو'علم الاسماء' کے زیور سے آراستہ کیا اور پھر زمین پر اُتارا۔ساتھ ہی یہ ہدایت بھی فرمائی کہ میری طرف سے جو ''علم وحی'' (علم ہدایت) تمہاری طرف آئے گا اس کے تحت'علم الاسماء' کا استعمال کرنا ہوگا۔

ناموں سے مراد کائنات میں پائی جانے والی چیزوں کے نام،ان کی خاصیتیں اور انسان کو پیش آنے والی مختلف کیفیات کا علم ہے مثلاً بھوک، پیاس،صحت اور بیماری وغیرہ۔اگر چہ آدمؑ کو ان چیزوں کی تعلیم دیتے وقت فرشتے بھی موجود تھے لیکن چونکہ ان کی فطرت میں ان چیزوں کی پوری سمجھ نہیں تھی اس لیے جب ان کا امتحان لیا گیا تو وہ جواب نہیں دے سکے۔اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے عملی طور پر انہیں باور کرا دیا کہ جو کام اس نئی مخلوق سے لینا مقصود ہے، وہ فرشتے انجام نہیں دے سکتے۔ بظاہر ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام صرف حضرت آدمؑ کی تخلیق سے متعلق تھے۔دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ آدمؑ کو سکھاتے وقت فرشتے موجود تو تھے لیکن چونکہ ان میں ان باتوں کو سمجھنے یا یاد رکھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔اس لیے وہ امتحان کے وقت جواب نہ دے سکے۔اس صورت میں ان کے جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ ہمیں وہی علم حاصل ہوسکتا ہے جو آپ ہمیں دینا چاہیں اور اس کی صلاحیت ہمارے اندر پیدا کر دیں۔

فرشتوں کے سامنے آدمؑ کی عظمت کا عملی مظاہرہ اور ان کا امتحان لینے کے لیے انہیں آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ سجدہ عبادت کا نہیں تعظیم کا سجدہ تھا جو بعض پچھلی شریعتوں میں جائز تھا۔ بعد میں تعظیم کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کی سختی سے ممانعت کر دی گئی تاکہ شرک کا کوئی شائبہ بھی پیدا نہ ہو۔ یہ سجدہ کروانا اس بات کا بھی مظہر تھا کہ فرشتوں کو اس بات کی تلقین کی جا رہی ہے کہ کائنات میں جو چیزیں ان کے اختیار میں دی گئی ہیں۔ وہ انسان کے لیے مسخر کر دی جائیں تاکہ یہ دیکھا جائے کہ وہ ان کو صحیح استعمال کرتا ہے یا غلط۔

اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے آدمؑ کو زمین پر اپنا نائب بنا کر بھیجنے کے لیے پیدا فرمایا تھا۔لیکن زمین پر بھیجنے سے پہلے انہیں جنت میں رکھنے اور اس کے بعد کے واقعات کا تکوینی مقصد بظاہر یہ تھا کہ ایک طرف حضرت آدمؑ جنت کی نعمتوں کا خود تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ ان کی اصل منزل کیا ہے، اور زمین پر پہنچنے کے بعد اس منزل کے حصول میں کس قسم کی رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں اور ان سے نجات پانے کا کیا طریقہ ہوگا؟ چونکہ فرشتوں کے مقابلے میں انسان کا امتیاز ہی یہ تھا کہ اس میں اچھائی اور برائی دونوں کی صلاحیت رکھی گئی تھی، اس لیے ضروری تھا کہ زمین پر بھیجنے سے پہلے اسے ایسے تجربے سے گزارا جائے۔ پیغمبر چونکہ معصوم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے کوئی بڑا گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ دراصل آدمؑ کی وہ غلطی ایک اجتہادی غلطی تھی یعنی سوچ کی یہ غلطی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو، شیطان کے بہکانے سے، ایک خاص وقت تک محدود سمجھ لیا، ورنہ اللہ تعالیٰ کی کھلی نافرمانی کا ہرگز ان سے تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم چونکہ اتنا قصور بھی ایک پیغمبر کے شایانِ شان نہ تھا، اس لیے اسے بعض آیات میں گناہ یا حکم عدولی سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس پر توبہ کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسمآءَ کُلَّھَا۔ کی تشریح کرتے ہوئے یہ بات واضح کی ہے کہ 'علم الاسماء' سارے کا سارا، اللہ رب العزت نے حضرت آدمؑ کے دل میں القاء فرمایا۔ اس میں انہوں نے سورہ سبا: ۱۰ اور اسی طرح سورہ الانبیاء: ۸۰ کے حوالے سے اس کی تشریح درج ذیل انداز میں کی ہے:

وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ (سورہ الانبیاء: ۸۰)

اور ہم نے انہیں تمہارے فائدے کے لیے ایک جنگی لباس (یعنی زرہ) بنانے کی صنعت سکھائی تاکہ وہ تمہیں لڑائی میں ایک دوسرے کی زد سے بچائے۔ اب بتاؤ کہ کیا تم شکر گزار ہو؟

یہ تعلیم بواسطہ الفاظ کے نہ تھی بلکہ القاء فی القلب کے ذریعہ سے تھی کہ ان کے دل میں (زرہ) بنانے کا طریقہ ڈال دیا...... پھر جن چیزوں کے نام اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو سکھائے ان چیزوں کی تصویروں کو فرشتوں پر پیش کیا۔ سورہ سبا: ۱۰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے داؤدؑ کو خاص اپنے فضل سے عطا کیا تھا اے پہاڑو! تم بھی تسبیح میں ان کے ساتھ ہم آواز بن جاؤ، اور اے پرندو! تم بھی اور ہم نے ان کے لیے لوہے کو نرم کر دیا تھا۔

حضرت داؤدؑ خود بھی بہت خوش آواز تھے، اور اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو بھی ان کے لیے مسخر کر دیا تھا کہ جب وہ ذکر اور تسبیح میں مشغول ہوں تو پہاڑ اور پرندے بھی، ان کے ساتھ تسبیح اور ذکر کرنے لگتے تھے اور ماحول میں ایک پُرکیف سماں بندھ جاتا تھا۔ پہاڑوں اور پرندوں کو ذکر و تسبیح کی صلاحیت عطا ہونا، حضرت داؤدؑ کا خاص معجزہ تھا۔

یہ حضرت داؤدؑ کے ایک معجزے کا بیان ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو لوہے کی وہ زرہیں بنانے کی خصوصی مہارت عطا فرمائی تھی جو اس زمانے میں جنگ کے موقع پر دشمن کے وار سے بچاؤ کے لیے پہنی جاتی تھیں۔ اس صنعت کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو یہ خصوصیت عطا فرمادی تھی کہ لوہا ان کے ہاتھ میں پہنچ کر نرم ہو جاتا تھا اور وہ اسے جس طرح چاہتے تھے موڑ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس بات کا بھی خاص ذکر فرمایا ہے کہ حضرت داؤدؑ کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ زرہ کی کڑیوں میں توازن قائم رکھیں۔ اس میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر کام اور ہر صنعت میں سلیقے اور توازن کا خیال رکھنا پسند ہے۔

اسی آیت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوہے کو ان کے ہاتھ میں نرم کر دیا تھا اور اسے جس طرح چاہتے موڑ لیتے تھے اور لوہے کی زرّہ اس طرح بناتے تھے کہ اس کے تمام خانے نہایت متوازن ہوتے تھے۔ علماء کرام نے اس آیت کے تحت فرمایا ہے کہ اس پر اس صنعت کے قابلِ تعریف ہونے کی طرف اشارہ ہے جو انسانوں کے لیے ہیں۔ معارف القرآن مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے مطابق ''علم الاسماء'' سے مراد تمام اشیاء کے نام ہیں اور تمام اشیاء کے ناموں سے مراد ان کی حقیقت کا علم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم تام اور عام عطا فرمادیا۔ مفردات اور مرکبات کے اسماء اور خواص اور

آ ثار بتلائے۔صنعتوں اورحرفتوں کاعلم ودیعت کیا۔حفظانِ صحت اورمعالجۂ امراض کے اصول وقواعد بتلا دیئے۔حضرت آدمؑ کو''اسماء'' کی تعلیم بذریعہ الہام کے تھی اوران کے دل میں ڈال دیا کہ......فلاں چیز کا فلاں نام ہے......اورحرف اورصوت درمیان میں نہ تھی...... بلکہ بطریق القاء بالقلب تھی۔جیسے

وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ (سورہ الانبیاء: ۸۰)

اس میں تعلیم بواسطہ الفاظ کے نہ تھی...... بلکہ''القاء فی القلب'' کے ذریعے سے تھی......کہ ان کے دل میں زرہ بنانے کا طریقہ ڈال دیا پھر جن چیزوں کے نام......اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو سکھائے ان کی تصویروں کو فرشتوں پر پیش کیا۔

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو آدیم ارض (یعنی روئے زمین) کی تمام اقسام کی مٹیوں سے ملا کر اور مختلف قسم کے پانیوں میں گوندھ کر بنایا ہے (اس وجہ سے حضرت آدمؑ کو تمام روئے زمین کی مٹیوں سے بنایا گیا ہے ان کی اولاد میں کوئی سرخ رنگ ہے......کوئی گورا اور کوئی بین بین......کوئی نرم خو اور کوئی ترش رو......کوئی نیک طینت اور کوئی بدطینت......اس کا ذکر مسند احمد، ابوداؤد اور ترمذی کی ایک حدیث میں آیا ہے) اور پھر برابر بنا کر آدمؑ میں روح پھونکی...... جو جنس ملائک سے ہے......اس طرح آدمؑ میں یہ استعداد اور صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ان چیزوں کے نام......خواص اور آثار جان سکے اور بتلا بھی سکے......اس لیے کہ یہ ساری استعداد اور صلاحیت اس میں جمع ہے۔جسمانی حیثیت سے آدمؑ زمینی ہیں......اور روحانی لحاظ سے علوی......اس لیے کہ آدمؑ علوی اور سفلی چیزوں کی جس قدر سمجھ رکھتے ہیں......دوسرا ایسی سمجھ نہیں رکھتا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے ایک منفرد مخلوق پیدا فرمائی۔جو اس سے پہلے نہ تھی۔

آدمؑ کے خمیر میں......زمینی اور آسمانی دونوں قسم کی استعداد اور صلاحیت علی وجہ الکمال موجود ہیں......اور یہ صرف اور صرف بشر کے ساتھ مخصوص ہے......ملائکہ کو میسر نہیں۔

ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ملائکہ کی قدرت ومشیت ان کے اختیار اور مرضی کے تابع نہیں...... بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہے......بخلاف انسان کے کہ اس کی قدرت ومشیت......خود اس کی مرضی کے تابع ہے......انسان ہی کا علم اور قدرت......اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کا نمونہ ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور بات آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ بہت سی چیزوں کا علم......محض عقل سے نہیں ہوسکتا...... جب تک قوتِ شہویہ اور قوتِ غضبیہ...... عقل کی معین ومددگار نہ ہو......اس لیے ایسی چیزوں کا نام وہی جان سکتا ہے اور بتلا سکتا ہے......جس میں قوتِ عقلیہ ورادراکیہ کے علاوہ قوت شہویہ اور

غضبیہ بھی ہو......جس سے ملائکہ تو بالکل فارغ ہیں اور جنات کا علم بھی ناقص ہے۔ناقص ہونے کے علاوہ غلبۂ ناریت اور قوتِ خیالیہ کے غلبہ کی وجہ سے نا قابل اعتبار ہے۔اس لیے یہ خدمت جو (انسان کو سونپی جارہی تھی)ان کے سپرد نہیں کی جاسکتی تھی۔

مزید برآں آدمؑ کو اشیاء کے تمام اوصاف ،خواص......اور اسماء کی تعلیم اس لیے دی تا کہ وہ اشیاء میں تصرف کرنے پر قادر ہو۔علم عام اور تام......آدمؑ کی استعداد کی ضرورت ہے کیونکہ یہ استعداد صرف آدمؑ ہی میں تھی مثلاً بھوک کی حقیقت جبرئیل نہیں سمجھ سکتے۔کیونکہ یہ استعداد......ان میں رکھی ہی نہیں گئی......اگر یہ استعداد، فرشتوں کو عطا کر دی جائے تو فرشتے فرشتے نہ رہیں......جیسے حس وحرکت خاصہ حیوان ہے۔اگر جماد میں یہ صفت پیدا فرمادی جائے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے)تو جماد، جماد نہ رہے گا۔ بلکہ حیوان بن جائے گا۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے مطابق انسانی علم کا تجزیہ کریں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک چیز کو پہچانتا ہے پھر اس کا نام رکھتا ہے یا اس کے لیے کوئی اصطلاح مقرر کرتا ہے......اس نام اور اصطلاح کے حوالے سے انسان بہت سے حقائق کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے......تو اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام نام سکھا دیئے۔گویا کل مادی کائنات کے اندر......جو کچھ وجود میں آنے والا تھا......ان سب کی حقیقت سے حضرت آدمؑ کو آگاہ کر دیا۔بالفاظ دیگر اس کے اندر ان چیزوں کے جاننے کی صلاحیت آدمؑ کو ودیعت کر دی گئی۔یہ انسان کا اکتسابی علم ہے جو اسے سمع وبصر اور عقل ودماغ سے حاصل ہوتا ہے۔

اسی سے ہم انسان کو حاصل ہونے والے علم کو دوحصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک الہامی علم (علم وحی) اور دوسرا علم بالحواس یا اکتسابی علم۔یہ علم انسان خود حاصل کرتا ہے...... اس نے آنکھوں سے دیکھا......کانوں سے سنا......نتیجہ نکالا اور دماغ پر کمپیوٹر نے اس پر کام کیا اور کہیں حافظے میں محفوظ کر لیا......پھر کچھ اور دیکھا، کچھ اور سنا کچھ چھو کر، کچھ چکھ کر، کچھ سونگھ کر معلوم ہوا......اور نتیجہ نکلا تو اسے سابقہ یاداشت کے ساتھ ملا کر......نتیجہ نکالا۔جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا۔

(بنی اسرائیل: ۳۶)

انسان کے اس اکتسابی علم کی بنیاد تین چیزوں پر ہے:

۱۔ سماعت　۲۔بصارت　۳۔عقل

حواس کے ذریعہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے......اس پر عقل کام کرتی ہے......اور مختلف فوائد اخذ کرتی

ہے...... یہ علم وہ علم ہے جو آدمؑ کو جنت میں ہی فرشتوں سے سوال و جواب کرنے سے پہلے ودیعت کیا گیا تھا۔ گویا یہ بالقوہ ودیعت کیا گیا علم ہے جس کا اظہار دنیا میں آنے کے بعد اپنے وقت پر جوں جوں انسان نے اپنی اس صلاحیت کو کام میں لاتے ہوئے اسے استعمال کیا تو نئی نئی چیزیں سامنے آئیں اور نئی چیزیں Un-cover یا Discover ہوئیں یا دریافت ہوئیں۔ اسی صلاحیت اور استعداد کی وجہ سے تمام تر ایجادات ظہور پذیر ہوئیں...... اور قیامت تک نا معلوم کیا کیا ظہور پذیر ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (جاری ہے)

اسلام اور مغرب ڈاکٹر عبدالغنی فاروق☆

عالمی صلیبی جنگ کا مقابلہ بذریعہ دعوت

ملک احمد سرور صاحب کے جواب میں چند معروضات

اس موضوع پر فریقین اپنے دلائل دے چکے۔ اگلے شمارے میں ان شاء اللہ، ہم اسے سمیٹنے کی کوشش کریں گے۔ مدیر

مَیں نے اپنے مضمون 'عالمی صلیبی جنگ کا مقابلہ کیسے ہو؟' (مطبوعہ 'قومی ڈائجسٹ' فروری ۲۰۱۴ء) جو البرہان کے شمارہ مئی میں 'سیاسی جدوجہد نہ مسلح جدوجہد۔ غلبۂ اسلام بذریعہ دعوت و صبر' کے عنوان سے جزواً شائع ہوا، میں دو تجاویز پیش کی تھیں: (۱) ہمیں بامرِ مجبوری یک طرفہ طور پر پیچھے ہٹ جانا چاہیے اور اسلامی نظام کی تحریکوں کو وقتی طور پر معطل کر دینا چاہیے (۲) ہمیں اب جدال و قتال کے ارادے ملتوی کر کے ساری توجہ جہاد بالقرآن پر مبذول کر دینی چاہیے۔ اور میرے بہت عزیز دوست ملک احمد سرور صاحب کو دونوں تجاویز سے اختلاف ہوا اور انہوں نے ان کا شدت سے ردّ کیا...... لیکن افسوس کہ انہوں نے اس پس منظر اور سیاق و سباق کا اشارۃً بھی ذکر نہ کیا جو مَیں نے مضمون کے آغاز میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ میں نے انیس اسلامی ممالک کی مثالیں پیش کیں (اور اب ان میں دو کا مزید اضافہ ہو گیا ہے: عراق اور نائیجیریا کا) کہ ساری مسیحی دنیا نے امریکہ کی قیادت میں گویا تہیہ کر لیا ہے کہ وہ کسی مسلمان ملک میں شریعت کے نفاذ کو برداشت نہیں کریں گے، کسی مسلم اکثریت کے ملک میں اسلامی پہچان کے کسی مسلمان حکمران کو زندہ نہیں رہنے دیں گے اور کوئی اسلامی جماعت ستر فیصد ووٹ بھی

لے کر کامیاب ہوگی تو اسے چلنے نہیں دیں گے اور یہ المناک صورتِ حال ۱۹۵۰ء سے اب تک جاری و ساری ہے۔ پورا عالم اسلام زخموں سے چُور چُور ہے اور بے بسی کی عجیب کیفیت میں مبتلا ہے۔ مصر میں صدر محمد مرسی اور ان کی جماعت کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے اس پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ شام میں تاریخ کا بدترین المیہ رونما ہو رہا ہے اور وہاں کی ساری سنی آبادی کو ختم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ نظر آ رہا ہے کہ یہی کچھ عراق میں ہوگا۔ مسلم اکثریت کے ملک نائیجریا میں ایک عیسائی صدر بن بیٹھا ہے اور وہاں کی ساری فوجی قیادت عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ اس صورتِ حال میں میں نے دُکھی دل کے ساتھ یہ

☆ ادیب، دانشور اور ماہرِ تعلیم، منصورہ، لاہور

تجویز کیا تھا کہ زمینی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے ہمیں بامر مجبوری اسلامی نظام کی تحریکوں کو وقتی طور پر معطل کر دینا چاہیے اور جدال و قتال کے ارادے ملتوی کر کے ساری توجہ جہاد بالقرآن پر مبذول کر دینی چاہیے...... مگر افسوس کہ ملک صاحب نے میری ان تجاویز کو مرزا غلام احمد قادیانی کے 'نظریہ جہاد' سے منتھی کر دیا، حالانکہ مرزا قادیانی کا تو کوئی نظریہ جہاد تھا ہی نہیں۔ وہ تو سرے سے جہاد ہی کا مخالف تھا اور اس کی 'نبوت' کا مقصدِ وحید جہاد کی تنسیخ تھا۔ میں نے جدال وقتال کے ارادے ملتوی کرنے کی تجویز دی ہے اور التوا کبھی بھی منسوخی کے معانی نہیں دیتا۔ اس کی نوعیت عارضی ہوتی ہے اور یہ ایک مجبوری کا عمل ہوتا ہے...... شادی کی تقریب کسی قریبی عزیز کی وفات کی وجہ سے ملتوی کر دی جاتی ہے لیکن اسے ختم نہیں کیا جاتا......اور جہاد وقتال کا التوا تو ہماری پوری تاریخ میں بار بار عمل میں آیا ہے۔ جب ہم نے تاتاریوں کے ہاتھوں بے مثال شکست کھائی تو سارے متاثرہ عالمِ اسلام میں کیا قتال وجدال کی تحریک ملتوی بلکہ معطل نہیں ہوگئی تھی اور ہندوستان میں انگریزوں کے قبضے کے بعد جہاد معرضِ التوا میں نہیں پڑ گیا تھا جو آج تک بحال نہیں ہوا۔ اسی طرح پورے عالمِ اسلام کا سیاسی ماحول جہاد کے لیے سازگار نہیں کہ اس کی سب سے بڑی شرط کسی مسلمان حکمران کی سرپرستی ہے۔ اسی طرح کسی ایک ملک میں بھی اسلامی شریعت کا عملی نفاذ نظر نہیں آتا اور اس المناک صورتِ حال کو اگر باقاعدہ تسلیم کر لیا جائے تو یہی حقیقت پسندی ہے اور یہی زمینی حقائق ہیں لیکن بدقسمتی سے کسی کمپلیکس (Complex) کے تحت اس کا ادراک نہیں کیا جا رہا حالانکہ نبی اکرمe کی پوری حیاتِ طیبہ عصری شعور کا بہترین نمونہ ہے جس کی مثالیں میں نے اپنے مضمون میں پیش کی ہیں۔

اس ضمن میں ملک صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ علامہ اقبال بھی عصری شعور اور زمینی حقائق کے زبردست حامی تھے جس کی ایک مثال میں نے مضمون میں پیش کی ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں علی گڑھ کالج کے طالب علموں میں اقبال نے انگریز کے خلاف اضطراب کی کیفیت دیکھی تو ایک منظوم پیغام میں انہیں پُرسکون رہنے کا مشورہ دیا اور یہاں تک فرمایا کہ ؎

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی

دورِ زوال میں اپنے خُم پر خشتِ کلیسیا کو قبول کر لینے کا مشورہ یہی زمینی حقائق کا ادراک ہے۔ رہی بات علامہ اقبال کے مبلغ جہاد ہونے کی تو کس کافر کو اس سے انکار ہے۔ خود میں نے ایک زمانے میں ایک مقالہ مرتب کیا تھا، جس کا عنوان تھا: ''اقبال کا خراجِ عقیدت شہداء اور جذبۂ شہادت کے حضور'' اور یہ سہ ماہی سیارہ'' کے شمارہ فروری مارچ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔

کسی غیرت مند اور باضمیر انسان کا جی نہیں چاہتا کہ اپنی شکست اور توہین کو تسلیم کر لے، لیکن زمانے کے تلخ حقائق کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور دورِ حاضر کی یہ بھی انتہائی تلخ حقیقت ہے کہ پورا عالم اسلام شکست خوردہ ہے، سیاسی اعتبار سے بھی اور اخلاقی و روحانی اعتبار سے بھی اور اس اندوہناک صورتِ حال کی مثال صدیوں کی تاریخ میں نظر نہیں آتی...... میں نے اسی تناظر میں موجودہ عالم اسلام کو حالتِ مکی سے تشبیہ دی تھی۔ اس ضمن میں چُول سے چُول ملانا اور ابوجہل، ابولہب اور ہجرت کی باتیں دور از کار ہیں۔

لیکن اُمید کی بے حد روشن کرن ہمارے ساتھ ہے اور وہ ہے قرآنِ حکیم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور دعوت کا وسیع میدان۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے علماء اور خصوصاً جہادی رہنما تدبر، حکمت اور دوراندیشی سے کام لیں، نعرے بازی کو ترک کر کے گہرا تفکر اور سنجیدگی اختیار کریں کہ ہماری یہ درگت کیوں بن رہی ہے اور پھر ایک طرف مسلمان عوام کی اخلاقی، تہذیبی اور روحانی تربیت کریں، اُن کے اندر خوفِ خدا اور احساسِ آخرت پیدا کریں اور اس کے ساتھ ہی غیر مسلم اقوام سے محاذ آرائی کا رجحان مکمل ترک کر کے، اُن کی ساری زیادتیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان تک قرآن کی تعلیمات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کا پیغام احسن طریقے سے، جدید ترین ذرائع اختیار کرتے ہوئے پہنچائیں تو گمان یہ ہے کہ چند سالوں میں صورتِ حال میں انقلابی تبدیلی آسکتی ہے کہ بہت سے شواہد کے مطابق وہ قومیں مزاج کے اعتبار سے بُری نہیں ہیں۔ امریکہ، کینیڈا، یورپ، آسٹریلیا اور جاپان فلاحی ریاستیں ہیں۔ وہاں انسان سُکھی ہے، وہاں قانون کی عملداری ہے، اُصولوں کی پاسداری ہے، ہر کام روٹین میں ہو جاتا ہے، مگر روحانی اعتبار سے وہاں شدید قسم کا خلاہے جس کی وجہ سے وہ قومیں نفسیاتی اور جسمانی امراض میں مبتلا ہیں اور عیسائیت ان کی رہنمائی کرنے میں ناکام رہی ہے اور شراب اور سیکس (Sex) بھی ان کا مداوا نہیں کر سکی اور مسائل کی دلدل ہے کہ گہری اور فراخ ہوتی جا رہی ہے اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ عیسائیت، یہودیت، ہندومت اور بدھ مت کسی کے پاس بھی ان مسائل کا کوئی حل نہیں ہے...... تاریخ کے اس انتہائی نازک موڑ پر اسلام اور صرف اسلام ہے جو دُکھی انسانیت کے زخموں پر پھاہا رکھ سکتا ہے...... کاش مسلمان اس وقت صرف داعی بن جائیں۔ اپنے کردار کا تزکیہ کریں۔ گہرے اخلاص کے ساتھ جدید ترین ذرائع کو استعمال

کرتے ہوئے احسن طریقے سے ان اقوام تک اسلام کا پیغام پہنچائیں تو چند سالوں میں انقلاب آ سکتا ہے اور تار تاریوں کی تاریخ ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو دہرا سکتی ہے......کاش اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا کر دے!

آنکھ دنیا کی ہر چیز کو دیکھ سکتی ہے مگر جب آنکھ کے اندر کچھ چلا جائے تو اسے نہیں دیکھ پاتی۔اسی طرح انسان دوسرے کے عیب تو دیکھتا ہے لیکن اپنے عیب اسے نظر نہیں آتے۔سچ کہا تھا ظفر نے ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

اسلام اور مغرب　　**ملک احمد سرور**☆

جہاد ترک نہیں کیا جا سکتا

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب کی خدمت میں جواب الجواب

میرے دل میں پروفیسر صاحب کا بہت احترام ہے، سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ان کے اس جواب پر کیا تبصرہ کروں۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ پروفیسر صاحب قرآن مجید، اقبالیات اور تاریخ سے اس حد تک نابلد ہیں۔ ''ساری مسیحی دنیا نے امریکہ کی قیادت میں گویا تہیہ کر لیا ہے کہ وہ کسی مسلمان ملک میں شریعت کے نفاذ کو برداشت نہیں کریں گے۔ اس صورت حال میں، میں نے دکھی دل کے ساتھ یہ تجویز کیا تھا کہ زمینی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے ہمیں بامر مجبوری اسلامی نظام کی تحریکوں کو وقتی طور پر معطل کر دینا چاہیے اور جدال وقتال کے ارادے ملتوی کر کے ساری توجہ جہاد بالقرآن پر مبذول کر دینی چاہیے۔'' یہ باتیں قرآن و تاریخ سے شناسا شخص نہیں کر سکتا۔ پروفیسر صاحب بتائیں کہ تاریخ کے کس دور میں اہل صلیب نے خوشی سے شریعت کو برداشت کیا ہے؟ انہوں نے عیسائیت کو بھی اس وقت قبول کیا جب پولس نے عیسائیت سے شریعت نکال دی۔

پھر لکھتے ہیں کہ ''جہاد وقتال کا التوا تو ہماری پوری تاریخ میں بار بار عمل میں آیا۔'' معلوم نہیں پروفیسر صاحب نے تاریخ کی کون سی کتب پڑھی ہیں جن میں جہاد کے التوا کا ذکر ملتا ہے۔ میں نے تو گزشتہ دو روز میں تاریخ کی کئی کتب کھنگال ڈالی ہیں، مجھے تو ''التوا کا ذکر'' کہیں نہیں ملا، بلکہ کتب احادیث میں یہ ملا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے راستے میں جہاد کرتی رہے گی اور اس کی مخالفت کرنے والے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔'' مزید یہ ملا: ''جہاد بند نہیں ہو گا یہاں تک کہ

یاجوج ماجوج نکل آئیں۔“ (بحوالہ فضائل جہاد از مولانا محمد مسعود اظہر، حوالہ النسائی) مزید یہ بھی ملا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو قوم بھی جہاد فی سبیل اللہ چھوڑ دیتی ہے، اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کر دیتا ہے اور جو قوم امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھوڑ دیتی ہے اللہ تعالیٰ اس پر عمومی عذاب مسلط کر دیتا ہے۔“

جہاد کے التوا کی ایک مثال انہوں نے تاتاریوں کی دی ہے: ”جب ہم نے تاتاریوں کے ہاتھوں بے مثال شکست کھائی تو سارے متاثرہ عالم اسلام میں کیا قتال و جدال کی تحریک ملتوی بلکہ معطل نہیں ہوگئی تھی؟“ میں نے تو تاریخ کی جتنی کتب پڑھی ہیں، وہاں تو بار بار یہ ذکر ملتا ہے کہ علماء کرام نے نوجوانوں کو تاتاریوں

☆ ایڈیٹر ماہنامہ چشمِ بیدار، خطیب اور آفاق

کے خلاف جہاد کے لیے مسلسل ابھارا۔ امام ابن تیمیہؒ نے تو اس جہاد میں خود شرکت کر کے تاتاریوں کے خلاف فتح بھی حاصل کی۔ بلاشبہ مسلمان فوجیں شکست کھاتی رہیں مگر مقابلے پر بھی پے در پے آتی رہیں یہاں تک کہ حمص کے مقام پر لشکر اسلام نے تاتاریوں کو تہس نہس کر دیا۔ اس شکست کے بعد ہی تاتار اسلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ اگر جہاد ملتوی یا معطل ہو چکا ہوتا تو کبھی مسلمان تاتاروں پر غالب نہ آتے، ہلاکو خاں کے بیٹے ریگا خان اور آبا قاخان شکست سے دوچار نہ ہوتے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب ”شکست، پسپائی، التوا، معطل“ میں فرق نہیں جانتے، اب ایسے فرد کو اتنا اہم مسئلہ کیسے سمجھایا جائے۔

جہاد کے التوا کی دوسری مثال میں وہ بتاتے ہیں کہ ”کیا ہندوستان میں انگریزوں کے قبضے کے بعد جہاد معرض التواء میں نہیں پڑ گیا تھا، جو آج تک بحال نہیں ہوا۔“ انگریزوں کے خلاف جہاد کی تحریک تو ماضی قریب بلکہ حال کا قصہ ہے۔ مولانا غلام رسول مہر اس جہاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ”وہ پورے سوا سو سال تک بے پروایانہ اور بے دریغ اپنی جانیں اور مال اس راہ میں قربان کرتے رہے۔۔۔۔ انہوں نے 25 سال تک سکھوں کو اور ایک سو سال تک برطانیہ جیسی قاہر قوت کو مسلسل آتش زیر پا رکھا۔“ (بحوالہ: سرگزشت مجاہدین) یہ اسی جہاد کے تسلسل کا نتیجہ تھا کہ 1947ء میں مجاہدین کی بڑی تعداد بلا تاخیر کشمیر پہنچ گئی اور پاکستانی کشمیر کا حصہ انہوں نے آزاد کرا کے پاکستان کے حوالے کر دیا۔ اگر جہاد ملتوی یا معطل ہو چکا ہوتا تو یہ مجاہدین اتنی جلدی نہ آ پاتے۔ 1979ء میں افغانستان پر روسی حملے کے بعد قبائلیوں کو متحرک کرنے میں کافی عرصہ لگ گیا تھا، اس لیے کہ قبائلی جہاد کی ذمہ داری پاک فوج کو سونپ چکے تھے۔ پروفیسر صاحب! شمالی قفقاز، بنگشا مورو، فلسطین، لیبیا ہر طرف نظر ڈال لیں، کب جہاد رکا ہے؟ شکست کھا کر کچھ عرصے کے لیے دب جانا یا روپوش ہو جانا اور التواء میں بڑا فرق ہے۔

اگر پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ اسلامی نظام کی تحریکوں کو معطل کرنے سے یا جہاد ملتوی کرنے سے صلیبی دنیا مسلمانوں کی دوست بن جائے گی تو وہ خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ قرآن مجید دوٹوک الفاظ میں بیان

کر چکا ہے: ''یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔'' (البقرہ:120)

پروفیسر صاحب نے ''غیر مسلم اقوام سے محاذ آرائی'' ترک کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ پروفیسر صاحب کوئی ایک مثال دیں کہ یہ محاذ آرائی مسلمانوں نے شروع کی ہے، جب انہوں نے شروع ہی نہیں کی تو ترک کیسے کریں؟ افغانستان اور عراق پر امریکہ نے حملہ کیا۔ سنکیانگ پر چین نے قبضہ کر رکھا ہے اور شمالی قفقاز پر روس نے، فلسطین پر اسرائیل نے، بنگشا مورو پر فلپائن نے، راکان پر برمانے، نائیجیریا پر عیسائی اقلیت قابض ہے۔ یہ غاصب ممالک قبضے چھوڑ دیں، محاذ آرائی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ پروفیسر صاحب بتائیں کہ وسطی افریقی جمہوریہ میں مسلمانوں نے کیا محاذ آرائی کی تھی؟ بہتر ہو کہ پروفیسر صاحب پورے منظر کو دیکھا کریں، ہاتھی کی دم کو پورا ہاتھی نہ سمجھیں۔

جہاد بالقرآن کے لیے وہ سورہ الفرقان کی آیت 52: ''پس اے نبیؐ! کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد ''جہاد کبیر'' کرو۔'' کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں مولانا مودودیؒ غیر مبہم الفاظ میں لکھ چکے ہیں کہ

> ''جہاد کبیر کے تین معنی ہیں: ایک، انتہائی کوشش جس میں آدمی سعی و جاں فشانی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ دوسرے، بڑے پیمانے پر جد و جہد جس میں آدمی اپنے تمام ذرائع لاکر ڈال دے۔ تیسرے، جامع جد و جہد جس میں آدمی کوشش کا کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی محاذ نہ چھوڑے، جس جس محاذ پر غنیم کی طاقتیں کام کر رہی ہوں اس پر اپنی طاقت بھی لگا دے اور جس جس پہلو سے بھی حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہو کرے۔ اس میں زبان و قلم کا جہاد بھی شامل ہے اور جان و مال کا بھی اور توپ و تفنگ کا بھی۔'' (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ 457، حاشیہ 67)

پروفیسر صاحب نے جس طرح قرآنی آیت کو اپنی مرضی کے معنی پہنائے، اقبال کے شعر ''بادہ ہے۔۔۔۔الخ'' کے ساتھ بھی انہوں نے یہی کیا ہے۔ اگر وہ اس شعر سے قبل کے اشعار کو سامنے رکھتے تو عیاں ہو جاتا کہ اقبال ''اپنے خم پر خشت کلیسا'' قبول کرنے کا مشورہ نہیں دے رہے بلکہ سستی و کاہلی اور ان کی ناپختگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اقبال نے علی گڑھ کے طلبہ کو جو مشورہ دیا تھا، وہ انقلاب کی ناپختہ خواہش پر دیا تھا۔ مجاہدین کی خواہش تو ناپختہ نہیں ہے۔ ان کا جذبۂ شوق تو اس حد تک ہے کہ اپنے جسم اڑانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ افغانستان میں وہ پانچ سال کامیاب حکومت کر چکے ہیں۔ کیا مصر کی اخوان المسلمون کی خواہش انقلاب بھی ناپختہ ہے؟ پروفیسر صاحب اگر حالات کا درست تجزیہ نہیں کر سکتے تو غلامی کا درس دینا بھی بند کر دیں۔ اقبال کے اس شعر کو بھی پڑھ لیں ؎

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

یہ شعر کہنے والا اقبال ملت کو کیسے سبق دے سکتا ہے کہ جہاد کو ملتوی کر دو۔ جس اقبال کا کلام جہاد کی تبلیغ سے بھرا پڑا ہے، وہ مفاہمت کا سبق نہیں پڑھا سکتا۔ وہ تو کہتے ہیں ؎

میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا   چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تُو تو اتر جا

وہ تو یہاں تک کہتے ہیں ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

پروفیسر صاحب سے اہم سوال: اگر اقبال کے شعر کا مطلب وہی ہے جو پروفیسر صاحب بتا رہے ہیں تو کیا علی گڑھ کالج کے طلبہ نے اقبال کی نصیحت کو قبول کر لیا؟ تحریک پاکستان کا جواب تو یہ ہے کہ علی گڑھ کے طلبہ نے اقبال کے پیغام کا درست مطلب سمجھا، انقلاب کی خواہش اور اپنے جذبۂ شوق کو پختہ کیا اور آزادی کی تحریک میں ہراول دستہ بنے۔ انہوں نے تحریک آزادی کو التوا میں نہ ڈالا۔ وہ پی ایچ ڈی نہیں تھے مگر اقبال کے پیغام کو بخوبی سمجھتے تھے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی اقبالیات کے معروف شارح ہیں، انہوں نے اس نظم ''طلبہ علی گڑھ کالج کے نام'' کی کیا تشریح کی ہے، یہ پوری نظم اور شرح کا ایک حصہ ذیل میں دے رہے ہیں، اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ موصوف پروفیسر ڈاکٹر عبد الغنی فاروق صاحب کس طرح ڈنڈی مارتے ہیں اور آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں۔ میری محترم پروفیسر صاحب سے گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو عزت و تکریم دی ہے، اسے یوں ضائع نہ کریں۔

طلبہ علی گڑھ کالج کے نام

اَوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے   عشق کے درد مند کا طرز کلام اور ہے
طائر زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم   یہ بھی سنو کہ نالۂ طائر بام اور ہے
آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں   کہتا تھا مورِ ناتواں لطف خرام اور ہے
جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا   اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیشِ جاوداں، ذوق طلب اگر نہ ہو   گردشِ آدمی ہے اور، گردشِ جام اور ہے
شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز   غمکدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے
بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی

رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسیا ابھی

یہ نظم اقبال نے 1907ء میں لکھی تھی۔ اس میں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ اپنی قوم کے نوجوانوں سے خطاب کیا ہے اور انہیں وہ پیغام دیا ہے جو اُن کی شاعری اور اُن کے فلسفہ کی ساری کائنات ہے یعنی عشق رسولؐ کا پیغام۔ اسی بات نے انہیں مسلمانوں کی آنکھ کا تارا بنادیا اور اُن کے کلام کو سند دوام عطا کر دی۔ واضح ہو کہ 1907ء کا زمانہ ہندوستان میں علی العموم اور بنگال میں علی الخصوص، سیاسی شورش کا زمانہ تھا۔ چونکہ مسلمانان ہند کے سامنے کوئی نصب العین نہیں تھا اور اُن کے گمراہ ہوجانے کا فوری اندیشہ تھا، اس لیے اقبال نے قوم کے نوجوانوں کو عشق اور عمل کا پیغام دیا۔ اس نظم میں ہمیں اُن تصورات کا ابتدائی نقش نظر آتا ہے جنھوں نے آگے چل کر ایک منظم فلسفۂ زندگی کی صورت اختیار کر لی۔ بالفاظ دگر اس نظم میں وہ چنگاریاں پوشیدہ ہیں جو کچھ عرصہ کے بعد شعلہ بن گئیں۔

اس نظم کا مفہوم پہلے شعر میں پوشیدہ ہے۔ یعنی اگر پہلے شعر کا مطلب سمجھ لیا جائے تو ساری نظم کا مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ کہتے ہیں کہ ارباب عقل، قوم کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ عقل کی پیروی کرو، لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ عشق کا اتباع کرو۔ بالفاظِ دگر اس نظم میں عقل اور عشق کا موازنہ پیش کیا ہے۔ یہ اقبال کا وہ محبوب موضوع ہے جسے انہوں نے پیام مشرق سے لے کر ارمغان حجاز تک ہر کتاب میں بیان کیا ہے، یعنی عقل پر عشق کی برتری۔ اب سوال یہ ہے کہ مسلک عقل اور مسلک عشق میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب تو بہت تفصیل طلب ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ مسلک عقل سے شریعت کے ظاہری پہلو کی اتباع مراد ہے اور مسلک عشق میں ظاہری پہلو کے علاوہ باطنی پہلو کی اتباع بھی شامل ہے۔ اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں مثلاً زید، شریعت کے ظاہری ارکان، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر پابندی کے ساتھ عمل کرتا ہے تو اربابِ عقل (اوروں) کے نزدیک وہ اسلام کے تمام تقاضوں کو پورا کر رہا ہے۔ یہ طبقہ زید سے کسی مزید عمل کا مطالبہ نہیں کرتا، لیکن ارباب عشق کے نزدیک ابھی زید کے ایمان میں نقص ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ زید حقیقی معنی میں اُس وقت مسلمان ہوگا، جب اس کے اندر، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر سر کٹانے کا جذبہ پیدا ہوجائے۔ پاکستان کے شاعر یکتا اور ملت اسلامیہ کے نامور فرزند حضرت مولانا ظفر علی خان صاحب قبلہ نے اسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے ؎

نماز اچھی حج اچھا روزہ اچھا اور زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود ان کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مسلک عشق کی رو سے مسلمان کا ایمان اس وقت کامل ہوسکتا ہے، جب وہ عشق

رسولؐ میں سرشار ہوکر اپنا تن من اور دھن سب کچھ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں نذر کر دے۔ ایک شخص پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے۔ رمضان کے تیسوں روزے رکھتا ہے۔ ہر سال زکوٰۃ ادا کر دیتا ہے اور بشرط استطاعت فریضۂ حج بھی بجالاتا ہے لیکن جب اسلام کے نام پر سر کٹانے کا موقع آتا ہے تو بڑی خاموشی کے ساتھ گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ اقبال کی اصطلاح میں یہ شخص مسلک عقل پر گامزن ہے۔ کیونکہ عقل اُسے سمجھاتی ہے کہ اگر تو مارا گیا تو پھر تیرے بیوی بچے برباد ہوجائیں گے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس کی بجائے مسلک عشق اختیار کرو، جو یہ کہتا ہے کہ کچھ پروا نہیں، اگر تیرے بیوی بچے برباد ہوجائیں اور تیرا سارا گھر لٹ جائے، مقصد حیات زن و فرزند نہیں بلکہ اسلام ہے۔ اس کی حفاظت اور بقاء کے لیے بے خطر میدان جہاد میں سر کٹا دے۔

دینی تحریکیں مدیر

جماعت اسلامی کی عظیم الشان خدمات
تبلیغی جماعت عالمِ اسلام کا دینی سرمایہ ہے

البرہان کی پالیسی یہ ہے کہ وہ ساری دینی جماعتوں، تحریکوں اور اداروں کا بہی خواہ اور مؤید ہے۔ وہ ان کی کامیابی کا خواہاں اور ان کے لیے دعا گو ہے۔ تاہم اس کے صفحات میں کبھی کبھار ایسی تحریریں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں ان دینی جماعتوں اور تحریکوں کی سوچ سے اختلاف کا اظہار ہوتا ہے یا انہیں مشورے دیے جاتے ہیں کہ اگر وہ یوں اور یوں کر لیں تو زیادہ بہتر نتائج نکل سکتے ہیں...... وغیرہ

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ علمی اور فکری امور میں اختلاف رائے، اگر وہ سلیقے اور شائستگی سے کیا جائے، کوئی بری بات نہیں ہوتی بلکہ اختلاف فکر و نظر سے بسا اوقات مسئلے کے بعض نئے پہلو سامنے آتے ہیں اور یہ علمی حرکت خرد افروزی اور حل مشکلات کا سبب بنتی ہے۔ دوسرے اگر تنقید اخلاص، ہمدردی، بہی خواہی اور نرمی سے کی جائے تو یہ اصلاح اور احتساب کا سبب بنتی ہے اور اس سے کارکردگی بہتر ہوتی ہے۔

ہاں! تنقید اس وقت مذموم ہوتی ہے جب وہ سوئے نیت اور ذاتی کدورت سے کی جائے یا اس کا محرک اخلاص کی بجائے ہوائے نفس یا ذہنی تلعب ہو، یا اس کے پیش نظر دوسرے فریق کی ہوا خیزی اور اسے نقصان پہنچانا ہو...... اور ہم ایسی تنقید سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

دینی جماعتوں کے قائدین، پیروکاروں اور کارکنوں کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر وہ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ان کی جماعت جس لائحہ عمل پر کاربند ہے وہ عموماً کسی نص کی اجتہادی تعبیر یا حکمت پر مبنی ہوتی ہے لہٰذا اس سے اختلاف نص سے اختلاف نہیں ہوتا مثلاً تبلیغی جماعت والے بھائی تبلیغ کے ایک خاص طریقے پر عمل کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ منصوص حکم یہ ہے کہ تبلیغ کی جائے لیکن کوئی خاص طریقہ منصوص نہیں ہے بلکہ بعض فائدوں اور حکمتوں کے پیش نظر بانئ جماعت نے یہ طریقہ ایجاد کیا۔ اب اگر کوئی مسلمان اس مخصوص طریقے میں کوئی تبدیلی تجویز کرتا ہے تو اسے گردن زدنی قرار نہیں دینا چاہیے مثلاً ہماری تجویز یہ ہے کہ تبلیغی جماعت اپنے حلقوں میں 'فضائل اعمال' کی بجائے قرآن حکیم کی تدریس کو معمول بنالے۔ ضروری نہیں ہے کہ تبلیغی جماعت کے اکابر ہماری اس تجویز کو مانیں لیکن ہمارے یہ تجویز پیش کرنے کو مذموم نہیں سمجھا جانا چاہیے اور نہ اسے تبلیغی جماعت پر تنقید اور دشمنی سمجھنا چاہیے۔

اسی طرح جماعت اسلامی اس امر کے لیے کوشاں ہے کہ ریاستی اقتدار نیک لوگوں کے ہاتھ میں آجائے تاکہ وہ اسے اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کریں۔ ظاہر ہے اس نیک مقصد سے ہمیں یا کسی اور مسلمان کو کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا لیکن جماعت نے اس مقصد کے لیے ایک طریق کار اور نظم قائم کیا ہوا ہے۔ ظاہر ہے یہ طریق کار اور نظم ایک اجتہادی کاوش ہے اور اس میں عقل وحکمت کی رو سے کمی بیشی ہوسکتی ہے چنانچہ اگر ہم جماعت کو مشورہ دیں کہ وہ اس غرض سے تقسیم کار کا طریقہ اختیار کرلے کہ جماعت دعوت واصلاح کا کام کرے اور اس کی ایک سیاسی جماعت ہو جو سیاسی جدوجہد کرے تو ہمیں محض یہ تجویز پیش کرنے پر جماعت کا مخالف اور دشمن نہیں سمجھا جانا چاہیے کیونکہ ہم جماعت کے محب اور بہی خواہ ہیں اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو اور اس کے لیے اگر ہم اس کے اجتہادی طریق کار میں ایک تبدیلی تجویز کررہے ہیں تو اسے تنقید اور دشمنی سمجھ کر اس میں برا منانے کی کیا بات ہے؟

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی کی عظیم الشان خدمات ہیں۔ وہ پاکستان میں برسر اقتدار نہیں آسکی لیکن اس کے باوجود اس نے پاکستانی سیاست کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے بہت سی شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں اور سیاسی کامیابیوں/ناکامیوں سے قطع نظر جماعت نے معاشرے کے پڑھے لکھے لوگوں کو اسلام کے قریب لانے اور انہیں اسلام پر مطمئن کرنے کے لیے جو دعوتی کوششیں کی ہیں وہ بے مثال ہیں اور ان ساری کوششوں کے لیے جماعت مستحق تبریک ہے اور اس کا ایک شاندار ریکارڈ ہے جس کے ہم اور دوسرے بہت سے غیر جانبدار مسلمان مدح خواں ہیں۔ **اللھم زد فزد**

اسی طرح تبلیغی جماعت امت کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ وہ اس وقت عالم اسلام کی سب سے بڑی تحریک ہے اور بلاشبہ اس کی کارکردگی موثر ہے اور اکثر اوقات وہ اپنے کارکنوں میں وہ تبدیلی لے آتی

ہے جو اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔

لہٰذا جماعت اسلامی ہو یا تبلیغی جماعت یا کوئی دوسری دینی تحریک ہم ان کے خیر خواہ ہیں، ان کی دینی خدمات کے قدر دان ہیں، ان کی ترقی اور کامیابی کے خواہاں ہیں۔ ہم ان کے دست و بازو ہیں تاہم کبھی کبھار ان کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے اگر ہم کچھ تجاویز پیش کردیں تو ان کو اور ان کے کارکنوں اور پیروؤں کو اس پر چیں بجبیں نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے اور ہماری مخلصانہ تجاویز پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ فجزاھم اللّٰہ عنّا خیر الجزاء۔

دینی تحریکیں *محمد رشید*☆

بسلسلہ تنظیم اسلامی کا منہج انقلاب

اعتراض سے اعتراف تک کا سفر

تنظیم اسلامی ہمارے عہد کی ایک معروف دینی نیم سیاسی تحریک ہے۔ وہ اپنی دیگر خوبیوں کے علاوہ اپنی دو اہم حسنات: ایک تحریک رجوع الی القرآن اور تراویح میں اردو خلاصہ سنانے اور دوسرے مساجد میں سادگی سے نکاح کو مروج کرنے کی وجہ سے مشہور ہے۔ دیگر دینی تحریکوں کی طرح ہم تنظیم اسلامی کے بھی مؤید اور بہی خواہ ہیں اور اس کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ تاہم تنظیم کی اصلاح اور بہتری کے لیے اگر کوئی تجویز سامنے آئے تو اس کے سننے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ ایک دانشور نے یہ خیال ظاہر کیا کہ تنظیم تعمیر فرد پر اتنی توجہ نہیں دے رہی جتنی اسے دینی چاہیے تو ہم نے اسے البرہان میں جگہ دے دی۔ تنظیم کے ایک حامی نے اس کا جواب دے دیا۔ ہم سمجھتے ہیں یہ کافی تھا کہ ہمارے پیش نظر مناظرہ اور اپنی بات ہر قیمت پر منوانا نہیں ہونا چاہیے بلکہ توجہ دلانا اور متبادل تجاویز پیش کرنا کافی ہے لیکن مصنف کا اصرار ہے کہ انہیں اپنی بات کی وضاحت کا ایک اور موقعہ ضرور دیا جائے چنانچہ ہم ان کا مضمون دے رہے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر تنظیم کے کسی آدمی کا جواب آتا ہے تو وہ بھی ہم طبع کردیں گے لیکن اس کے بعد اس سلسلے کو جاری رکھنے سے ہم معذرت خواہ ہیں۔ مدیر

ماہنامہ البرہان کی دسمبر 2013ء کی اشاعت میں راقم کے 12 صفحاتی مضمون ’’غلبہ اسلام

بذریعہ احتجاجی سیاست'' کے جواب میں محترم جمیل الرحمان عباسی صاحب نے ''تنظیم اسلامی کا منہج اور چند مغالطے'' کے عنوان سے 23 صفحاتی مضمون تحریر فرمایا جو البرہان کے مارچ، اپریل اور ماہنامہ میثاق کے جون 2014ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

محترم عباسی صاحب نے راقم کے مضمون میں اٹھائے گئے نکات میں سے چند نکات (اعتراضات) کا جواب عنایت فرمانے کے بعد ''حرف آخر'' کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے کہ: ''محمد رشید صاحب کی طرف سے پیش کیے گئے اعتراضات کے جوابات میں ہم نے جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے لٹریچر سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ یہ اقتباسات ثابت کرتے ہیں کہ پیش کیے گئے اعتراضات درست نہیں ہیں۔''

☆ ملتان (abu_munzir1999@yahoo.com)

دلچسپ بات یہ ہے کہ موصوف نے ہماری تردید میں سید مودودی مرحوم کے جو اقتباسات تحریر فرمائے ہیں ہمارے فہم کے مطابق تو وہ ہمارے موقف کی تائید کرتے ہیں۔ کیسے؟ اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر ہوگی۔

محترم عباسی صاحب کے چار نکاتی ''جواب برائے اعتراض'' کے پہلے دو نکات اسلامی فکر میں گھس آنے والے ایک فسادی لفظ ''انقلاب'' پر ہماری تنقید سے بحث کرتے ہیں جبکہ آخری دو نکات میں راقم کے مضمون کے مرکزی خیال ''غلبہ دین بذریعہ احتجاجی سیاست'' میں بیان کیے جانے والے راقم کے الزام/ اعتراض کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ لفظ ''انقلاب'' کا دفاع کرنا ضروری سمجھا گیا ہے۔

ہماری کوشش ہوگی کہ محترم عباسی صاحب کے 23 صفحاتی مضمون کا تجزیہ 46 صفحات میں کرنے کی بجائے نہایت اختصار کے ساتھ اور کم سے کم لفظوں میں پیش کر دیا جائے۔ طوالت سے بچنے اور اختصار کی غرض سے ہمیں موصوف کے مضمون کی بعض جزوی خامیوں سے صرف نظر کرنا ہوگا۔

ہمارے زیر بحث مضمون میں تنظیم اسلامی پر جو مرکزی نکات/ اعتراض اٹھائے گئے، ان میں سے اہم ترین اعتراض یا الزام (''احتجاجی سیاست/ غیر مسلح تصادم) کی جناب عباسی صاحب نے تصدیق فرمادی ہے جبکہ باقی اہم تر اعتراضات پر خاموشی کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ ان اہم بنیادی اعتراضات کا جواب دینے کی بجائے صرف لفظ ''انقلاب'' ہی کو منوانے کی غرض سے کم و بیش 17/18 صفحات تحریر فرمائے گئے ہیں۔ ان سطور کا نہایت حقیر راقم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہے کہ لفظ انقلاب پر یہ بے معنی بحث درحقیقت اصل زیر بحث موضوع کو نظروں سے اوجھل کرنے کی کوشش ہے۔

راقم کے مضمون کا پہلا صفحہ اس کے دکھ کو درج ذیل الفاظ میں پیش کر رہا ہے:

1۔ ’’لیکن یہ ایک دردناک المیہ ہے کہ وہ تنظیم جو جماعت اسلامی کے ’’ایمانی، اخلاقی اور دعوتی سپرٹ کے بحران‘‘ کے نتیجے میں وجود میں آئی، معاشرے کی ذہین اور بے چین روحیں جب اپنی ایمانی ،اخلاقی ، دعوتی اور روحانی پیاس بجھانے اس تنظیم کے دامن میں آ کر پناہ گزیں ہوتی ہیں تو بہت جلد ’’ایمانی، اخلاقی اور دعوتی سپرٹ کے بحران‘‘ کے ایک منفرد اور تکلیف دہ المیہ سے ان کا واسطہ پڑتا ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے کہ ایسے بے چین اور مخلص افراد اپنے جسم و روح کی گہرائیوں سے اس ’’بگاڑ‘‘ کی اصلاح کرنا چاہتی ہیں اور اس کے لیے اول و آخر زور کردار سازی اور قول و فعل کی ہم آہنگی کے لیے تزکیہ وتعمیر سیرت پر اپنی صلاحیتوں کو مرکوز کرنا چاہتی ہیں۔ یہ بے چین و مخلص افراد قرآن حکیم، سیرت نبوی اور تنظیم اسلامی ہی کے بنیادی لٹریچر اور مقصد وجود سے استدلال کرتے ہوئے تنظیم اسلامی میں در آنے والے بگاڑ پر قابو پانا چاہتے ہیں، تنظیم کی مساعی کو انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت اصلاح وتزکیہ کے منہاج پر ڈال کر، تنظیم اسلامی کو معاشرے میں پاکیزہ تبدیلی کی ایک طاقتور آواز اور ایک ایکسو پلیٹ فارم بنانا چاہتے ہیں لیکن اپنی ان نہایت صالح ،مقدس اور مبارک آرزوؤں اور عزائم کے باوجود انہیں ٹکراؤ کی لائن پر لگا دیا جاتا ہے۔‘‘

راقم کے زیر بحث مضمون کی باقی تمام تحریر اسی دکھ کی تشریح ہے۔ درج بالا الفاظ میں پیش کیے جانے والے ہمارے گلہ پر موصوف کی خاموشی نیم رضامندی ہے یا حقائق سے نظریں چرانا؟

2۔ راقم کے اعتراض کا دوسرا نکتہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

’’تنظیم اسلامی، جو ہماری نگاہوں میں نہایت محترم جماعت ہے، جس کے ہم دس سال تک ’’رفیق‘‘ بھی رہے ہیں، گزشتہ کئی سالوں سے ایک نہایت سنگین مغالطہ میں پھنس چکی ہے......

مغالطہ نمبر ۱۔ اسلام کا نفاذ اور غلبہ خون بہائے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ کے دور میں بھی مسلح قتال ہوا تب جا کر اسلام کو غلبہ ملا۔

مغالطہ نمبر ۲۔ عصر حاضر کی تمدنی ومعاشرتی تبدیلیوں میں اجتہاد کے ذریعے مسلح قتال کا متبادل غیر مسلح قتال بمعنی پُرامن احتجاجی تحریک کے منہاج کو اسلام کے غلبہ کے لیے اختیار کرنا ضروری ہو گیا ہے۔‘‘

محترم عباسی صاحب نے ہمارے اس الزام کو ان الفاظ میں تسلیم کیا ’’تنظیم اسلامی نے احتجاجی تحریک کا طریقہ خود ایجاد کیا ہے۔ تنظیم کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ منہج انقلاب نبوی ﷺ کے آخری مرحلے مسلح تصادم کا متبادل ہے‘‘۔

3۔ تنظیم اسلامی کی اس خودساختہ ’’ایجاد‘‘ پر اعتراض کرتے ہوئے ہم نے اپنے زیر بحث مضمون میں عرض کیا تھا کہ:

''قطع نظر اس بات کے کہ یہ نقطہ نظر اور دعویٰ کس حد تک معقول ہے؟اور یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی محکم نصوص ، خاص طور پر قتال فی سبیل اللہ کے قرآنی حکم میں ''اجتہاد'' کے نام سے کسی تبدیلی کی دعوت دینا کوئی علمی اور معقول طرز عمل ہے؟ ہم اس سوال سے بھی بحث نہیں کرتے کہ کیا جہاد/ قتال فی سبیل اللہ کا منہاج نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام یا دین میں وہی محل اور مقام ہے جو مقام اسے تنظیم اسلامی کے بانی ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کئی عشروں تک اپنے دروس میں دیتے رہے؟......

......سوال یہ ہے کہ **طریق کار کے چوائس** کے ضمن میں جو حق اور آزادی آپ اپنے لیے استعمال کرتے ہیں تو آپ کس اتھارٹی اور دلیل کی بنیاد پر دوسروں سے **اپنی رائے سے مختلف طریق کار** اختیار کرنے پر ان سے چوائس کا حق چھین لینا چاہتے ہیں۔کیا ''احتجاجی سیاست'' آسمان سے اترا ہوا کوئی صحیفہ ہے جس کو مضبوطی سے تھام لینے کی صبح شام آپ دعوت دیے چلے جارہے ہیں۔اور کیا ''انتخابی سیاست'' قرآن وسنت کی کسی بھی نص سے ''کارحرام'' ثابت ہوتا ہے جسے آپ دینی جماعتوں کے لیے شجرممنوعہ ثابت کرنے میں عقل ومنطق کی کوئی بھی دلیل رائیگاں نہیں جانے دیتے؟''

اس کے جواب میں محترم عباسی صاحب نے درج بالا اقتباس کے ''لب ولہجے'' کو تلخ اور کڑوا قرار دیتے ہوئے تحریر فرمایا کہ: **''ہم پر یہ اعتراض درست نہیں کہ ہم دوسروں کو طریق کار کی چوائس کا حق نہیں دیتے۔ہم عرض کرتے ہیں کہ ہم نے کبھی یہ حق چھینا ہی نہیں''**۔اس کے بعد موصوف نے ''تبدیلی بذریعہ انتخاب (Election)'' کا رد کرتے ہوئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کے دلائل کا خلاصہ یوں بیان فرمایا::

☆ ''ہمارے نزدیک تاریخ انسانی میں آج تک کوئی انقلاب انتخابات کے ذریعے نہیں آیا''

☆ ''نظام اسلام کے قیام کے لیے الیکشن میں حصہ لینا "Exercise in futility" کے سوا کچھ نہیں ہے۔یہ محض قوت اور وقت کا ضیاع ہے''

اب ذرا غور فرمایا جائے کہ ''حق چھیننے'' سے ہماری مراد کیا ہے؟ طریق کار کے حق کے استعمال کے خلاف جو نرم سے نرم الفاظ تنظیم اسلامی کے ذمہ داروں کے پاس ہو سکتے ہیں وہ یہی ہیں جن کا ذکر اوپر کی سطور میں ہوا ہے۔یعنی ''**قوت اور وقت کا ضیاع**''۔الیکشن کے جس آپشن کو اختیار کرنے کی پاداش میں ''جماعت اسلامی اور اس کی قیادت'' بانی تنظیم اسلامی کی طرف سے کم وبیش نصف صدی تک نہایت سخت ترین تنقید کا نشانہ بنتی رہی لیکن جماعت اسلامی چھوڑنے کے کم وبیش 25 سال بعد (انتخابی سیاست کے مقابلہ میں) ''غیر مسلح تصادم'' (احتجاجی سیاست) کا آپشن ایجاد کیا جاتا ہے۔اسی رویے کو ہم نے آپشن کا حق چھیننا قرار دیا۔جو ذہن دوسروں کے طرز عمل کو، تزکیہ وتربیت اور مسلح تصادم (قتال فی

سبیل اللہ) کے ''انقلابی مراحل'' چھوڑ کر جمہوری سسٹم کی عطا ''انتخابی سیاست'' میں صلاحیتوں کو گم کرنے کی پاداش میں، ''حرفِ غلط'' قرار دیتا ہو، وہی ذہن جب ''تزکیہ و تربیت'' اور مسلح تصادم (قتال فی سبیل اللہ) سے فکری و عملی ہر دو سطحوں پر اغماز اور فرار کا مظاہرہ کرے اور جمہوری سسٹم ہی کی عطا ''احتجاجی سیاست'' کو انقلابی طریق کار کا نام دے کر اس میں اپنی صلاحیتوں کو گم کر دے تو اس بدتر ''حرفِ غلط'' کو ''حرفِ صحیح'' کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

آج اگر محترم عباسی صاحب ایک سانس میں تنظیم اسلامی کی طرف سے یہ اعلان فرماتے ہیں کہ ''**الیکشن نفاذ اسلام کے لیے سودمند نہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہے**'' اور اگلے ہی سانس میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''دینی سیاسی جماعتوں نے 2004 میں ایم ایم اے کی صورت میں جب متحد ہو کر الیکشن لڑنے کا اعلان کیا تو محترم ڈاکٹر صاحب نے ان کی حمایت میں ایک اخباری اشتہار کی صورت میں لوگوں سے اپیل کی کہ **نفاذ شریعت کی خاطر قوم کو چاہیے کہ ایم ایم اے کو ووٹ دے**'' تو وہ خود ہی بتائیں کہ اس رویہ کا نام ''تضاد فکری'' نہیں تو اور کیا ہے؟ جناب عباسی صاحب کے اس حوالہ سے تو کم از کم یہ ثابت ہوتا ہے کہ نصف صدی تک جماعت اسلامی کو الیکشن میں حصہ لینے کی پاداش میں ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم جس تندوتیز اور نہایت سخت تنقید کا نشانہ بناتے رہے وہ محض وقت کا ضیاع تھا کیونکہ 2004ء میں جا کر یہ عقدہ کھلا کہ الیکشن نفاذ شریعت کے لیے سودمند بھی ہوسکتے ہیں اسی لیے تو ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے قوم سے یہ اپیل کی کہ ''**نفاذ شریعت کی خاطر قوم کو چاہیے کہ ایم ایم اے کو ووٹ دے**''۔

صاحبو! عصر حاضر کے ایک عظیم عبقری سید مودودی علیہ الرحمہ کے انتخابی طریق کار پر ہم آپ کے حقِ تنقید کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ آپ اپنی صلاحیتوں اور اوقات کا عظیم ترین حصہ اسی ''حقِ تنقید'' ہی پر ضائع فرماتے چلے جائیں۔ بعد ازاں جماعت اسلامی سے الگ ہونے کے ربع صدی (1980ء) کے بعد آپ جو متبادل طریق کار ایجاد فرما رہے تھے، وہ عقل و نقل کی کسی بھی دلیل سے ''انتخابی طریق کار'' سے برتر، بہتر، فائدہ مند، موثر اور محفوظ نتائج کا حامل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ میرے محترم! آپ کو میرے لہجے کی تلخی اور کڑواہٹ کا گلہ ہے۔ میں معذرت خواہ ہوں، لیکن یہ تلخی اور کڑواہٹ اس نظام کی عطا ہے جسے جڑ سے اکھاڑنے کی دعویدار تنظیم اسلامی ہے، مگر اس باطل نظام کو جڑ سے بدلنے کے لیے جس درست لائحہ عمل پر صلاحیتوں اور توجہات کو مرکوز کرنے کی ضرورت ہے، اپنے اساسی پروگرام اور ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ......کرنے کا اصل کام'' (ہمارے زیر بحث مضمون میں جس کا باحوالہ ذکر بھی کیا گیا) میں اس کا زوردار اظہار کرنے کے باوجود، اس سے شدید غفلت اور لاپرواہی برتی گئی۔ اس پر اگر راقم کے لہجے میں تلخی اور کڑواہٹ در آئی ہے تو تنظیم اسلامی کے دوست میری اس تلخی اور کڑواہٹ پر مجھے معذور سمجھتے ہوئے درگذر فرمائیں۔

ان ساری باتوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے اس ''ایجاز'' پر راقم نے سوالات اٹھائے تھے کہ :

''سوال یہ بھی ہے کہ آخر ''انتخابی سیاست'' میں وہ کون سی برائی ہے جس سے ''احتجاجی سیاست'' بالکلیہ پاک ہے۔ ''انتخابی سیاست'' اور ''احتجاجی سیاست'' دونوں ہی جدید تمدنی دنیا کی عطا ہیں۔ یہ دراصل مغرب کی متمدن ومہذب دنیا کے متفق علیہ ''جمہوری نظام'' کے اہم ارکان اور اعضاء ہیں۔ جبکہ پچھلے دو سو سال کا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ عالم مغرب یہ اٹل فیصلہ کر چکا ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں ریاستی سطح پر اسلام کے سیاسی ومعاشی احکام وقوانین کو نافذ کرنا ناممکن کر دیا جائے۔ مغرب کے مقتدر طبقات یہ طے کر چکے ہیں کہ ان کی حیاباختہ، خدا بے زار اور مادہ پرست دجالی تہذیب کا سب سے بڑا دشمن، سب سے بڑا حریف اور سب سے بڑا مخالف اسلام ہے۔''

اور یہ کہ ''لہٰذا عالم مغرب کا مقتدر طبقہ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ اسلام پسند چاہے کوئی سا بھی ذریعہ اور راستہ اختیار کریں، چاہے وہ انتخاب کا ذریعہ اختیار کریں، چاہے احتجاج کا یا کوئی اور...... ریاست کی سطح پر اسلام کا راستہ ہر حال میں روکنا ہے۔ عالم مغرب کی اسلام پسندوں پر نہایت گہری نگاہ ہے اور وہ اسلام پسندوں کو کسی قیمت پر یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اسلام پسند ''جمہوری نظام'' کے اہم آلات یعنی انتخابی سیاست یا احتجاجی سیاست کو بروئے کار لا کر اسلام کے نفاذ اور غلبہ کو ممکن بنائیں۔ اپنے اس فیصلہ میں مغرب اس حد تک رجڈ اور جذباتی ہے کہ اس کی خاطر بالفرض اسے ''جمہوری نظام'' کی جان یعنی انتخابی سیاست کا گلا دبانا پڑے تو وہ بلاتوقف ایسا کر گزرتے ہیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے جس جس خطے میں اسلام پسند اپنی بہترین حکمت عملی اختیار کر کے بذریعہ ''انتخابی سیاست'' حکومت بنانے کے قابل ہوئے مغرب کے گماشتوں نے ان کا تختہ الٹ دیا اور انہیں بندگلی میں دھکیل دیا۔ یہ ہیں وہ حقائق جو واضح کرتے ہیں کہ جدید ومتمدن دنیا کے عالمی شیطان اگر اسلام کی راہ روکنے کے لیے اپنے ہی ''جمہوری نظام'' کی جان یعنی انتخابی سیاست کا گلا گھونٹ سکتے ہیں تو وہ اپنے اسی مقصد کی خاطر ''جمہوری نظام'' کے ایک اہم عضو یعنی ''احتجاجی سیاست'' کا گلا دبانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ مصر کے تجربہ نے تو یہ بات ثابت کر دی ہے کہ مغرب کے عالمی شیطان اور ان کے آلہ کاروں نے نہ صرف مصر میں ''جمہوری نظام'' کی جان یعنی انتخابی سیاست کا گلا کاٹ کے رکھ دیا بلکہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ''احتجاجی سیاست'' کا گلا دبانے میں بھی کامل درندگی، حیوانیت اور شیطانیت کا مظاہرہ کیا۔''

جناب عباسی صاحب کے مضمون میں ہمارے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔

5۔ اس کے بعد ہم نے ایک اہم سوال ان الفاظ میں اٹھایا کہ ''**بھلا بتایا جا سکتا ہے کہ مسلم اکثریتی علاقوں، خاص طور پر پاکستان میں، جس کے آئین میں ''قرآن وسنت'' کی بالادستی اور حاکمیت کو**

تسلیم کیا گیا ہے، نظام کی وہ کون سی تبدیلی ہے جو مسلم جماعتیں بذریعہ انتخابات دوتہائی اکثریت حاصل کرنے کے بعد روبہ عمل نہیں لاسکتیں اور محض احتجاجی سیاست ہی کے ذریعہ سے لائی جاسکتی ہیں۔ انتخابات میں حصہ لینے پر اسلامی تحریکوں پر جو فرد جرم عائد کی جاتی ہیں مثلاً اخلاقی، ایمانی، شرعی امور میں مداہنت سے کام لینا، تعمیر سیرت وتزکیہ وتربیت اور دعوت دین سے غفلت برتنا، مروجہ سیاسی ہتھکنڈوں اور برائیوں کو اختیار کرلینا وغیرہ وغیرہ تو کیا بتایا جاسکتا ہے کہ احتجاجی سیاست یا ''احتجاجی تحریک'' کے منہاج میں بالقوہ وہ کون سی خوبی ہے کہ اس کو اپنانے والی جماعتیں ان برائیوں سے محفوظ رہیں گی۔ اسلامی جماعتوں کو غلبۂ اسلام بذریعہ انتخابی سیاست ناکامی کے جتنے امکانات ہیں کم وبیش اتنے ہی امکانات ناکامی کے غلبہ اسلام بذریعہ ''احتجاجی سیاست''/غیر مسلح تصادم میں ہیں۔''

جناب عباسی صاحب کا مضمون ہمارے اس سوال کا بھی کوئی جواب عنایت نہیں فرماتا۔ (جاری ہے)

انتہا پسندی و دہشت گردی

پروفیسر ملک محمد حسین ☆

مسلم انتہا پسندی اور دہشت گردی

علاج کیا ہے؟

انتہا پسندی ایک ذہنی نفسیاتی رویہ ہے جس کی بنیاد تعصب، ضد، عدم برداشت اور اپنے خیالات، تصورات اور یقینیات کے معاملے میں یک رُخے پن پر ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص کا خیال، تصور اور یقین حق پر مبنی ہو تو حق پر مبنی ہونے کے اعتماد کی وجہ سے اس شخص میں دوسروں کو سُننے، مذاکرہ ومباحثہ کرنے اور دلیل کے ساتھ اپنی بات کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے کیونکہ کسی بھی بحث ومباحثہ کے نتیجہ میں اُسے اپنے خیال اور عقیدے کے باطل ہونے یا مسترد ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ ضد، عدم برداشت اور تعصب تو اس گروہ میں ہوگا جسے اپنا خیال، تصور اور یقین پر دلیل کی بنیاد پر قائم رہنا نظر نہیں آتا۔ ہاں اگر صحیح العقیدہ اور راست خیال شخص یا اشخاص کا علم سطحی اور فہم خام ہو تو اس شخص یا ان اشخاص سے ضد اور تعصب پر مبنی رویے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ فہم وادراک اور علم ویقین انسان کو ذہنی وسعت، وسیع المشربی اور اختلاف واتفاق کے معاملے میں نرم خُو بناتی ہے۔

صحیح الخیال اور راست عقیدے کا حامل گروہ اس صورت میں بعض اوقات (ہمیشہ نہیں) ضد، تعّصب اور عدمِ برداشت کا شکار ہوسکتا ہے جب باطل قوتیں میڈیا کے پروپیگنڈے، جھوٹ پر مبنی الزامات، ماورائے دلیل اور ماورائے حقیقت کہانیوں اور سیاسی وفوجی قوت کے زور پر اہل حق کو دیوار کے

ساتھ لگا دیتی ہیں۔ جب حق وصداقت کا راستہ بزور روکا جائے، جب بحث ومباحثہ کے راستے بند کر دیئے جائیں جب باطل پر مبنی نظامِ حیات ریاستی اور عالمی جبر کے ذریعہ نافذ کرنے کی کوشش کی جائے تو مجبور اور مقہور گروہ حق کے داعی ہونے کے باوجود محض قیامِ وجود کی خاطر عدمِ برداشت کے رویوں کا شکار ہوجاتے ہیں لہٰذا اہل حق وصداقت کے رویے" تنگ آمد بجنگ آمد" کو عدمِ برداشت کا نام دینا انصاف کی بات نہیں ہے۔

انتہا پسندی کے متعلق ان تمہیدی کلمات کے بعد ہم اُس صورتِ حال کی طرف آتے ہیں جو اس وقت پوری اسلامی دنیا میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً جاری ہے۔ پوری اسلامی دنیا بشمول پاکستان

☆ جوہر آباد (malikmh786@yahoo.com)، 0333-4404260

اس وقت بدترین انتہا پسندی اور دہشت گردی کا شکار ہے۔ پاکستان میں انتہا پسندی کی جڑیں ایک طرف تو لبرل فاشسٹوں کے رویوں میں آشکارا ہیں تو دوسری طرف اس کے ڈانڈے عالمی فسطائی قوتوں خصوصاً امریکی سامراج اور اُس کے گماشتوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں اندرونی انتہا پسندی کا ایک شاخسانہ کسی حد تک فرقہ واریت کے ذہن کی پیداوار ہے۔ مذکورہ انتہا پسندی کو کسی طرح بھی اسلامی انتہا پسندی کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

اسلام تو اعتدال پسندی، امن اور احترام وفروغِ انسانیت کا دین ہے۔ یہ کوئی نیا دین نہیں۔ یہ تو ازل سے ابد تک تمام انسانوں کا دین ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام سے لے کر اسمٰعیل علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ تک سب کا دین تھا۔ موسیٰؑ کے امتی اور عیسیٰؑ کے امتی سب مسلمان ہی تھے۔ یہ تو نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد جب موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے امتیوں نے آپ ﷺ کا انکار کیا تو وہ یہودی اور عیسائی بن کے رہ گئے اور شرفِ مسلمانی سے محروم ہوئے۔

انتہا پسندی اور دہشت گردی کا ایک پہلو عالمی ہے اور دوسرا پہلو مسلم معاشروں کا اندرونی پہلو ہے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو فی الحقیقت عالمی پہلو غالب حیثیت رکھتا ہے۔ چند سال پہلے امریکہ کے دو تھِنک ٹینکس رینڈ کارپوریشن اور انٹرنیشنل کرائسز گروپ (ICG) نے مسلم معاشروں کی جو تقسیم کی ہے اور جس کو وہ بڑھاوا دے کر (اُن کی زبان میں) بنیاد پرست مسلمانوں کا زور توڑنا چاہتے تھے ان میں سُنی اسلام، شیعہ اسلام، صوفی اسلام، وہابی اسلام، حربی اسلام (Militant Islam) اور بنیاد پرست اسلام کی اصطلاحیں استعمال کر رہے تھے۔ امریکہ اور روس کی حلیف مغربی اور مشرقی طاقتوں کو اُن کا مشورہ تھا

کہ سُنی اور شیعہ کی خلیج کو بڑھایا جائے۔صوفی اسلام کی دامے درمے اور سخنے معاونت کی جائے۔دیوبندی اسلام کو نظر میں رکھا جائے اور حربی نیز بنیاد پرست اسلام کو کچلنے کا راستہ اختیار کیا جائے۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا تھنک ٹینکس کی سفارشات پر بہت حد تک عمل ہو چکا ہے اور اس سمت میں تیزی سے مزید کاروائیاں ہو رہی ہیں۔ تیونس، مصر اور لیبیا کے حالات کو ذہن میں رکھیں اور غور فرمائیں کہ کس طرح عرب بہار کا رُخ موڑ کر اسلامی قوتوں کو کچلا گیا۔شام،عراق اور افغانستان کی صورتِ حال پر نظر ڈالیں کہ کس طرح ان ممالک میں معاشروں کو تہہ و بالا کر دیا گیا۔ایران اور سعودی عرب کو کس طرح متحارب قوتوں کی طرح آمنے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔خلیجی ریاستوں اور سعودی عرب میں اندر ہی اندر شیعہ سُنی مخاصمت کو انتہا تک پہنچا دیا گیا۔ پاکستان میں فرقہ واریت پر مبنی کالعدم جھگڑالو تنظیمیں قابو سے باہر ہو رہی ہیں۔ بھارت، امریکہ، اسرائیل اور دیگر مغربی ملکوں کی خفیہ تنظیموں نے نفوذ کر کے کم از کم پاکستانی طالبان کو ایسے راستے پر لگا دیا ہے جس میں اسلام اور مسلمانوں کا گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔اسلامی معاشروں کی فضا کو اس قدر گدلا کر دیا گیا ہے کہ اچھی بھلی صحیح الفکر جماعتیں اور افراد بھی اپنے بیانات اور طور اطوار میں توازن اور اعتدال قائم رکھنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔

دیگر مسلم معاشروں میں عموماً اور پاکستانی معاشرے میں خصوصاً فرقہ واریت پر مبنی انتہا پسندی نے قلب و اذہان کو مکمل طور پر جکڑ رکھا ہے۔ ہر گروہ بظاہر قرآن وسنت کی بنیاد پر سٹینڈ لیے کھڑا ہے لیکن بباطن اپنے حزبی، معاشی، سیاسی بلکہ سفلی مفادات کی آبیاری کر رہا ہے۔ملی یک جہتی کونسل اور ملی مجلس شرعی کے پلیٹ فارم ہوں یا بین المذاہب اور بین لمسالک کانفرنسیں، ہمارے محترم اور مقتدر علماء کرام کا رخ انور ان پلیٹ فارموں پر کچھ اور دکھاتا ہے لیکن اپنی حزبی مجالس میں اور اپنے مریدانِ باصفا کے سامنے اُن کا چہرہ بالکل بدل جاتا ہے۔ رمضان المبارک میں سحری اور افطاری کے اوقات کے سادہ سے معاملہ پر ہمارے ان "متقی" حضرات کا سٹینڈ 90 درجے کے زاویے پر ہوتا ہے تو ایسے مسائل جن میں اخذ ونتائج پر غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے اُن پر ان حضرات کا اتفاق تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یہ اختلاف رائے جب ضد، انا، تعصب کا شکار ہو کر عدمِ برداشت کی حدوں کو چھونے لگتا ہے تو وہ مسائل جنم لیتے ہیں جن کا اب ہم شکار ہیں۔

اسلامی معاشرے ایک عرصے تک مغربی استعماری قوتوں کے زیرِ نگیں رہے۔ ان مغربی استعماری قوتوں نے تعلیمی نظام اور سیاسی تدابیر سے ہمارے قلوب و اذہان ہی بدل کر رکھ دیئے۔ ان مغربی استعماری قوتوں نے نظر نہ آنے والا ایک ایسا خودکار فکری نظام (Perpetual Thinking System) ہمارے خمیروں میں ڈال دیا کہ ان کے جانے کے بعد ہم خود مغرب کے سیکولر نظام کے پرُ

جوش معاون بن گئے۔آپ ذرا پاکستانی معاشرے پر ہی نظر ڈالیں، ہمارا تعلیمی نظام، ہمارے سماجی طور اطوار، ہمارا میڈیا اور ہمارا اصارفانہ رویہ کیا اب زیادہ مغرب پرست اور سیکولر نہیں ہوگیا بمقابلہ اس کے کہ جیسے ہم 1947 سے پہلے تھے۔ ہم آرزو تو اسلامی ہونے کی کرتے ہیں لیکن ہمارے تمام افعال اور ہمارے تمام مطالبات سیکولرزم کو پروموٹ کرتے ہیں۔ ہماری تمام مذہبی اور دینی جماعتیں اس پر متفق ہیں کہ حکومت کو مذہبی معاملات میں مداخلت کا کوئی حق نہیں اور ہم ایسی کسی مداخلت کو بزور روکیں گے جبکہ حکومتی زعما اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مُلا کو حکومتی معاملات سے علیحدہ رکھنا ہے۔ ہمارے یہ مقتدر زعما دین کو ریاست، سیاست، عدالت، بازار اور لین دین کے معاملات میں نافذ کرنے کے قائل نہیں۔

کہنے کو تو ہم ایک اسلامی ریاست ہیں۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔قراردادِ مقاصد اسلامی معاشرے کی واضح سمت متعین کرتی ہے۔آئین کا آرٹیکل 31 حکومت کی ذمہ داری ٹھہراتا ہے کہ وہ عوام کو تعلیم وتربیت کے ذریعے اس قابل بنائے کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے مطابق، جیسا کہ قرآن وسنت میں بتایا گیا ہے، گزار سکیں۔سپریم کورٹ کے دو تین سال پہلے دیئے گئے ایک فیصلے کی رُو سے پاکستان کے آئین کے مطابق پورا قرآنِ حکیم دستور کا عملی حصہ ہے۔دستور کی یہ شق بھی موجود ہے کہ پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت کے احکامات اور تعلیمات کے خلاف نہیں بن سکتا۔

اسلامی نظریاتی کونسل بھی موجود ہے جس کا فریضہ حکومت کی اسلامی راہنمائی ہے۔شرعی عدالت بھی موجود ہے جس کے اختیار میں ہے کہ وہ کسی بھی قانون کو جو قرآن وسنت کے خلاف ہو کالعدم قرار دینے کا حکم دے سکتی ہے۔ اتنے کھلے، غیر مبہم اور واضح آئینی اور قانونی اہتمامات کے باوجود اگر پاکستان میں اسلامی نظام کا بول بالا نہیں ہو رہا تو ہماری رائے میں اس کی واحد وجہ ہم سب کا سیکولرسٹ رویہ ہے۔افسوس یہ ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی انقلاب کے لیے تسلسل کے ساتھ جدوجہد کرنے والی اسلامی تحریک بھی بسا اوقات فرقہ پرست اور سیکولرسٹ مذہبی جماعتوں کو (شاید) خوش کرنے کی خاطر اُسی رو میں بہہ جاتی ہے اور نعرہ زن ہوجاتی ہے کہ ہم حکومت کو اجازت نہیں دیں گے کہ وہ دینی مدارس کی آزادی اور خود مختاری پر کوئی قدغن لگائے حالانکہ ا دینی مدارس کی آزادی اور خود مختاری نے جہاں مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کیا ہے وہاں سب سے زیادہ نقصان تحریکِ اسلامی کو پہنچایا ہے۔تعصب ،ضد، انا اور شدید فرقہ پرستی کی فضا میں تحریکِ اسلامی کس طرح پروان چڑھ سکتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں تمام تر کوششوں کے باوجود اسلامی نظام اپنی صحیح صورت میں قائم کرنے کا خواب پورا نہیں ہو رہا۔

پورا عالم اسلام اس وقت ایک آتش فشاں پر کھڑا ہے ہر طرف افراتفری اور خانہ جنگی کا سماں

پیدا ہورہا ہے۔ امریکی استعمار نے اپنا معاشرہ محفوظ بنا کر اسلامی معاشروں میں جنگ وجدل کی ایسی چنگاری چھوڑی ہے جو مغربی استعماری سازشوں کی وجہ سے پھیلتی ہی جارہی ہے۔ہم بھی دشمن کا آلہ کار بن کر خود ہی اسے پھیلا رہے ہیں اور خود ہی اس میں بھسم ہونے کے خطرے سے دو چار ہیں۔

قتل عام ہورہا ہے تو صرف مسلمانوں کا، معیشت تباہ ہورہی ہے تو مسلمانوں کی اور تقسیم در تقسیم کا ایجنڈا ہے تو صرف مسلمان معاشروں کے لیے......سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کے ماحول میں اسلام کا بول بالا ہوسکتا ہے؟ کیا اس طرح کی صورت حال میں عالم انسانیت اسلام کی فیوض و برکات سے بہرہ ور ہوسکتی ہے؟ اور کیا مسلمان ایک امت واحدہ کی شکل میں زندہ رہ سکتے ہیں؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان تمام سوالوں کے جوابات نفی میں ہیں۔اس کے بعد سوال اُٹھتا ہے کہ

پس چہ باید کرد

انتہا پسندی، فرقہ واریت اور دہشت گردی پر قابو پانے کے لیے اُن عوامل پر غور کرنا ہوگا جن کی وجہ سے یہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔سب سے پہلا عامل تو کفر اور سیکولرزم کی اندورنی اور بیرونی قوتوں کا جبر ہے جو وہ اسلام کے خلاف پروپیگنڈے، میڈیا اور تعلیمی اداروں میں بے حیائی کے مناظر، عریانی اور فحاشی کے جبری فروغ نیز اباحیت اور جنس پرستی اور عورت کو جنس بازار بنانے کا عمل ہے۔ان سب کو روکنا حکومت کا کام ہے اگر حکومت دل وجان سے چاہتی ہے کہ انتہا پسندی اور دہشت گردی ختم ہو تو اسے ان تمام خرابیوں کو مئوثر طریقہ سے روکنا ہوگا اور صحت مند تفریحی سرگرمیوں کو فروغ دینا ہوگا۔

دوسرا بڑا عامل فرقہ واریت پر مبنی دینی مذہبی تعلیم ہے۔اس عامل کا جب تک استیصال نہیں ہوتا فرقہ واریت پر مبنی انتہا پسندی کو روکنا مشکل ہے تیسرا بڑا عامل مسالک کے درمیان مساجد قائم کرنے کی مقابلہ بازی ہے۔نماز فرض ہے اور جائے نماز یعنی مسجد کی سہولت تمام مسلمانوں تک پہنچانا اور اس سہولت کو ریگولیٹ کرنا حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔قیام صلوٰۃ کا لازمی جزو مساجد ہیں، مساجد کا قیام اہتمام اور قرآن وسنت کی روشنی میں مساجد کا نظم برقرار رکھنا قراردادِ مقاصد اور آئین کے آرٹیکل 31 کے تحت حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔اتفاقِ رائے سے مساجد کے نظم کا قیام علماءِ حق کی راہنمائی اور اُن کی نگرانی میں کرنا ہوگا جس کے لیے پورا سسٹم بنایا جاسکتا ہے۔اسلامی نظریاتی کونسل اور وزارتِ مذہبی اموراس سلسلہ میں اپنا رول ادا کریں تو معاملات درست ہوسکتے ہیں۔

فرقہ واریت اور انتہا پسندی کا چوتھا بڑا عامل مسلکی بنیادوں پر سماجی تنظیمات اور سیاسی جماعتیں ہیں۔اسلامی نظریے کے فروغ اور اسلامی نظریہ حیات کی تنفیذ کے لیے تو دینی سیاسی جماعتوں کی گنجائش ہے لیکن فقہی، مسلکی اور مذہبی مفادات کے حصول کے لیے سیاسی جماعتوں کی تشکیل کسی طرح

پسندیدہ نہیں ہے۔ اس وقت شدید فرقہ پرستی اور مذہبی گروہ بندی کی شاید سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ نمایاں مذہبی لیڈر زاپنے زورِ بیان پر مریدانِ باصفا کا ایک حلقہ پیدا کر لیتے ہیں اور پھر ان مریدوں کو بنیاد بنا کر ایک سیاسی گروہ کھڑا کر لیتے ہیں۔

فرقہ پرستی، انتہا پسندی اور دہشت گردی کو روکنے کا ایک طویل المیعاد اور ذہنوں کو بدلنے والا منصوبہ بھی ہے

یہ ایک طویل اور صبر آزما منصوبہ ہے جس پر عمل کر کے حالات کا رُخ موڑا جا سکتا ہے۔ اس منصوبہ کی بنیاد تعلیم ہے اور صرف تعلیم۔ اس تعلیم میں رسمی تعلیم بھی ہے اور غیر رسمی تعلیم بھی۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک عظیم تعلیمی تحریک برپا کرنے کی ضرورت ہے ایک ایسی تعلیمی تحریک جس کی بنیاد رسول ﷺ کے قرآن میں بیان کیے گئے معلمانہ فرائض ہوں۔ اللہ رب العزت نے رسول ﷺ کے فرائض رسالت کے حوالے سے تعلیم و تربیت کے چار پہلو بیان کیے ہیں یعنی تلاوتِ آیات، تعلیمِ کتاب، تعلیمِ حکمت اور تذکیہ نفس۔ مجوزہ تعلیمی تحریک کے یہی چار اساسی مقاصد ہوں اور موجودہ تعلیمی اداروں میں یہی سب کچھ نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ نئے ادارے بھی بنائے جائیں جو تعلیم و تربیت کے ان چار قرآنی پہلوؤں کو بنیاد بنائیں۔ نعرہ زن ہوئے بغیر خاموشی سے کام کیا جائے۔ دھوم دھڑکے والی ریلیوں، بے مقصد مطالبوں اور ہر اِیشو پر لٹھ برداریوں سے اجتناب کیا جائے۔ ساتھ ساتھ موجود دینی مدارس اور مغربی طرز کے سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں بھی مثبت اور محبانہ معاونت کے ساتھ تطہیر افکار، تطہیر نصابات اور تطہیر ماحول کا کام کیا جائے۔ تدریسی اور تعلیمی لٹریچر تیار کرنے پر توجہ دی جائے۔ دستوری اور آئینی آلات کو کام میں لا کر حکومتوں کو بھی قائل کیا جائے، حکومتی مشینری میں موجود ایسے اذہان جو اسلامی تڑپ رکھتے ہیں انہیں متحرک کیا جائے۔ حتیٰ کہ پارلیمنٹ میں بھی ایسے احباب مل جائیں گے جو راستہ ملنے پر تعاون کریں گے۔ ایک ہمہ گیر پُرامن اور محنت پر مبنی تعلیمی تحریک زیادہ سے زیادہ بیس سالوں میں رنگ لائے گی۔ کوششوں میں جوش اور خلوص ہوگا تو شاید دس سالوں میں ہی تبدیلی نظر آنے لگے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے

یہ کرے گا کون؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کارِ خیر کے کرنے کے لیے ملک میں اِدھر اُدھر بیٹھے کئی لوگ موجود ہیں۔ کئی چھوٹی بڑی تنظیمیں ہیں جو اپنی سی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ ان منتشر افراد اور تنظیموں کو اکٹھا کر کے ایک پلیٹ فارم مہیا کرنے کی ضرورت ہے۔ ان سب کو اکٹھا کون کرے گا اور خود اپنی پوری طاقت اس کارِ خیر میں کون جھونکے گا؟ ہماری نظر میں اس کارِ خیر کی اہل جماعتِ اسلامی ہے۔ اگر وہ تعلیم کو واقعی اپنی ترجیح اول

قرار دے دے اور دیگر سرگرمیوں کو کچھ عرصہ کے لیے کم کر دے تو تبدیلی کی امید کی جا سکتی ہے۔اس کے ساتھ اگر علماءِ کرام اللہ کا خوف دل میں پیدا کر کے اپنے فرائض منصبی کی طرف متوجہ ہوں اور محض خطبہ ہائے جمعہ کو ہی عوام کی دینی (مسلکی نہیں) تعلیم وتربیت کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیں تو چند سالوں میں منظر بدل جائے گا اور پاکستان کا اسلامی معاشرہ انتہا پسندی اور دہشت گردی، ملاوٹ اور چور بازاری ،رشوت اور بدعنوانی ،فرقہ وارانہ جھگڑوں اور گروہی چپقلش سے چھٹکارا پالے گا۔اگر علماءِ گرام ازخود یہ کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو آئین پاکستان کا آرٹیکل 31 حکومت کو اس بات کا ذمہ دار بناتا ہے کہ وہ اس کا اہتمام کرے۔کیا جماعتِ اسلامی اور اس طرح کی دیگر جماعتیں جو ملتِ اسلامیہ کی وحدت کی حامی اور فرقہ واریت کی مخالف ہیں حکومت کو اس بات پر قائل نہیں کریں گی کہ وہ قرار دادِ مقاصد اور آرٹیکل 31 کے مطابق اپنی ذمہ داری پوری کرے؟